قرآن کریم میں اصلاح کا مفہوم

اسباب ومظاہر

مصنف

ڈاکٹر اسماعیل الحسنی

مترجم

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

(کتاب میں پیش کئے گئے خیالات کا ناشر کی رائے سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے، کوئی تیسرا شخص کتاب کو ویب سائٹ یا کسی اور ذریعے سے عام کرتا ہے تو اس کے مصدر اصلی کے مطابق ہونے کی ذمہ داری ناشر کی نہیں ہے)۔

نام کتاب (اردو)	:	قرآن کریم میں اصلاح کا مفہوم-اسباب ومظاہر
نام کتاب (عربی)	:	**مفهوم الاصلاح فی القرآن الکریم- دراسة فی اسبابه ومظاهره**
تالیف	:	ڈاکٹر اسماعیل الحسنی
مترجم	:	ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی
صفحات	:	192
تعداد	:	500
سن اشاعت	:	2025

ISBN : 978-81-995727-1-3

باهتمام

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

ناشر

ایفا پبلیکیشنز-نئی دہلی

161-ایف، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

ای میل:ifapublications2004@gmail.com

فون:011 - 26981779

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

مقدمہ:	۷
مبحث اول: اصلاح کے مفہوم کی اہمیت	۹
مبحث دوم: اصلاح کے مفہوم کے لغوی تجزیہ کے حدود	۱۸
مبحث سوم: اصلاح کا مفہوم اور اس کے اسباب ومظاہر کے شعور کا فقدان	۲۵
فصل اول	۳۲
اصلاح کے تشکیلی اسباب	۳۲
مبحث اول: جمود کے مقابلہ میں تدافع	۳۳
مبحث دوم: انتہاپسندی کے مقابلہ میں راہ اعتدال	۶۶
فصل دوم	۷۹
اعتقاد کو درست کرنے کے مظاہر	۷۹
مبحث اول: وحدانیت کی حقیقت اور آسمان وزمین کے بگاڑ کا اصول	۸۲
مبحث دوم: ایمان کے ارکان ومصالح	۸۵
مبحث سوم: اعتقادی تصور	۹۰
فصل سوم	۹۸
فکری اصلاح کے مظاہر	۹۸
مبحث اول: فکری درستگی کے عقلی اصول	۹۹
مبحث دوم: فکری درستگی کے عقلی اصول کا کردار	۱۰۵

فصل چهارم ۱۱۲
مظهر اصلاح عمل ۱۱۲
مبحث اول: نفسانی عمل ۱۱۳
مبحث دوم: جسمانی عمل ۱۲۳
مبحث سوم: تدبیری عمل ۱۴۸
خاتمه ۱۸۳
مصادر و مراجع ۱۸۹

☆☆☆

مقدمہ

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جس نے نیک عمل کو بلند فرمایا(۱)، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوال کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ مفسد اور مصلح کو جانتا ہے(۲)۔

اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندہ اور رسول ہیں، جن کو سارے جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا، اے اللہ! ہمارے سردار محمد ﷺ، ان کی آل و اولاد، صحابہ اور قیامت تک ان کے طریقہ اور نقش قدم پر چلنے والوں پر رحمت، سلامتی اور برکت عطا فرما۔

حمد و درود کے بعد:

جائزہ لینے والوں اور چھان بین کرنے والوں کا تقریبا اس پر اتفاق ہے کہ لفظ ''اصلاح'' ان بنیادی الفاظ میں سے ہے، جن کا سیاسی اور ذرائع ابلاغ کی گفتگو، نیز مسلمانوں کے معاملات اور احوال سے مربوط علمی اور فکری سرمایہ کی مختلف شکلوں میں بکثرت استعمال ہوا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ ہاں، اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن بہت جلد ہمارے مفکرین، مؤرخین اور فقہاء کی اکثریت اس بات کا بھی اعتراف کر لے گی کہ اصلاح (کی سعی و کاوش) ناکام رہی ہے، اور زیادہ تر مسلمانوں کو اس کے موانع اور رکاوٹوں سے آگے بڑھنے کی قدرت نہیں ہے۔

۱- اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**إليه يصعد الكلم الطيب والعمل الصالح يرفعه**" (فاطر:۱۰) (اچھی باتیں اسی کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہیں، اور نیک اعمال کو وہ بلند فرماتا ہے۔

۲- اللہ تعالی کا فرمان ہے: "**والله يعلم المفسدمن المصلح**" (سورۂ بقرہ:۲۲۰) (اور اللہ جانتا ہی ہے کہ کون بگاڑ چاہتا ہے اور کون اصلاح چاہتا ہے۔

مؤرخ استاذ عبداللہ عروی کی رائے میں عالم عربی میں اصلاح کی ناکامی کے متعدد اسباب ہیں، جن میں نمایاں اور قوی تر سبب یہ ہے کہ اصلاح حاکم ومحکوم کے لحاظ سے ایک مفہوم کا حامل نہیں ہے، نیز ان کے نام سے گفتگو کرنے والے فقہاء اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے اعتبار سے بھی یہ ایک مفہوم کا حامل نہیں ہے(۱)، مفکر استاذ محمد عابد جابریؒ کا اس بات پر اصرار ہے کہ ہمارے اغیار ہمارے ممالک میں جس اصلاح کو قائم کرنے کے متمنی ہیں، اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ ان کے الفاظ میں اس کا آغاز ''بگاڑ پیدا کر کے ہوا ہے، یہ محض موجودہ متوقع درستگی میں ہی بگاڑ نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ حقیقی اصلاح کی راہ کے نقوش بھی مٹا دیئے گئے ہیں، نیز اس تصور پر بھی پردہ ڈال دیا گیا ہے جو اصلاح کا طالب ہو''(۲)۔

فقیہ استاذ علوانیؒ اپنے عملی تجربات اور اکیڈمک مطالعہ کا اس سلسلہ میں نچوڑ پیش کرتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلی چیز جو معاصر اسلامی تحریکات کی سرگرمیوں اور فکر میں موجود نہیں ہے، وہ اصلاح کا منہجی فہم ہے(۳)۔

۱- حاکم کے لحاظ سے اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ دشمنوں کو دفع کرنے کے ذریعہ اقتدار کو مضبوط کیا جائے، اس مقصد کی خاطر عصری طریقہ سے فوج کی ٹریننگ اور فوج کو مسلح کرنے کا آغاز کیا جائے، جبکہ محکوم کی نظر میں اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ فساد وزوال کے اسباب کا خاتمہ کیا جائے، جن میں سرفہرست مطلق العنانی اور ڈکٹیٹرشپ ہے۔ عروی، عبداللہ، ''مفہوم الدولۃ'' الدار البیضاء: المرکز الثقافی العربی، ط:۸، ۲۰۰۸ء، صفحہ ۱۳۰ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۲- جابری، محمد عابد، ''فی نقد الحاجۃ إلی الإصلاح''، بیروت: منشورات مرکز دراسات الوحدۃ العربیۃ، ط:۱، ۲۰۰۵ء، ص؛۱۵-۱۶۔

۳- علوانی، طہ جابر'' أبعاد غائبۃ فی فکر وممارسات الحرکات الإسلامیۃ المعاصرۃ''، قاہرہ: دار السلام، ط:۱، ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۵ء، ص:۶۷۔

مبحث اول

اصلاح کے مفہوم کی اہمیت

شروع میں ہی ہم اس حقیقت سے خبردار کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جو ایک یا چند مصالح پر مشتمل نہ ہو، علم رکھنے والے جانتے ہیں، اور جو علم نہیں رکھتے ہیں وہ ناواقف ہیں، لہذا ہم اسے بعید نہیں قرار دیتے ہیں کہ قرآنی اصلاحی گفتگو کے بارے میں بحث متعدد علمی مباحث سے مربوط ہے، چنانچہ اس گفتگو کے سلسلہ میں بحث فقہ سے مربوط ہے؛ کیونکہ عبادات، معاملات اور عقوبات وغیرہ دیگر فقہی ابواب کا مقصد لوگوں کی مصلحت ہی ہے(۱)۔

اسی طرح اس اصلاحی گفتگو کے بارے میں بحث علم کلام سے بھی مربوط ہے، اس سلسلہ میں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے کہ معتزلہ نے ''صلاح و درستگی'' کے نظریہ کو ان اصولوں میں سے ایک اصول قرار دیا ہے جن پر ان کے مذہب کی بنیاد ہے، بلکہ بعض معتزلہ ''اصلح'' کے قائل ہیں، یعنی اللہ تعالی صرف وہ کام کرتا ہے جو صلاح و درستگی پر مبنی ہو۔

ایسے ہی علماء اصول بالخصوص اہل مقاصد دین، جان، عقل، نسل اور مال کے تحفظ کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، جس کے دائرہ میں اسلامی شریعت اپنے معانی، احکام اور مقاصد کے لحاظ سے آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد، معاشرہ اور امت کی صلاح و درستگی کا دوام ان کے

۱- مثال کے طور پر عقوبات اور حدود (سزاؤں) کی مشروعیت اس زمینی صلاح و درستگی کے تحفظ کی خاطر ہے، جس کے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ انسانی جان کی حفاظت ہو اور ناحق اس کا قتل نہ ہو، اس لئے کہ فرمان باری تعالی ہے: ''ولكم فى القصاص حيوة يأولى الألباب'' (سورۂ بقرہ:۱۸۹) (اے دانشمندو! قصاص (یعنی جرائم پر عادلانہ سزا دینے) میں ہی تمہاری زندگی (کا تحفظ و بقا) ہے۔

نزدیک اس تحفظ کو اس کے تینوں درجات: ''ضروریات''، ''حاجیات''، اور ''تحسینیات''، نیز ہر درجہ کے مکملات (تکمیلی امور) کے ساتھ قائم کرنے سے مربوط ہے۔

اسی طرح قرآن مجید کا مفسر قرآنی آیتوں کے درمیان ربط و مناسبت سے پردہ اٹھانے میں مشغول رہتا ہے(۱)۔

مصلحت کے ساتھ قرآنی نسخ کے تعلق کی تحدید کرنے والے فہم کے اصول کے مدنظر بعض ماہرین قرآن کریم نے ''اس قرآن کے درمیان جس پر عمل نہ کیا جائے اور اس قرآن کے درمیان جس پر عمل کیا جائے'' امتیاز قائم کیا ہے(۲)۔

۱- یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ماہر اہل علم میں سے منتخب افراد ہی اس بحث کو انجام دینے کی جسارت کر سکتے ہیں۔ قدیم دور میں بعض اہل علم نے ''علم مناسبت'' کے حاملین کی کمی کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ بہ قول ابوبکر بن عربی ''صرف ایک عالم نے اس سے تعرض کیا ہے، جنہوں نے سورۂ بقرہ میں اس کام کو انجام دیا ہے۔ اللہ تعالی نے اس علم کی مناسبت سے پھر ہمیں توفیق دی، ہم نے اس کے حاملین کو جب نہیں پایا، اور خلق الٰہی کو بے کار افراد کی صفات سے متصف دیکھا، تو ہم نے بھی اس پر مہر لگا دی، اللہ تعالی اور اپنے درمیان اسے راز سربستہ بنالیا اور اسے اسی کے حوالہ کر دیا۔ دیکھئے: بقاعی، برہان الدین ابراہیم بن عمر، ''مقاصد النظر للإشراف علی مقاصد السور''، تحقیق: عبد السمیع محمد احمد حسنین، ریاض: مکتبہ المعارف، ط:۱، ۱۹۸۷ء، ج۱، ص: ۱۳۷-۱۳۸۔ حق اور درست بات یہ ہے کہ یہ ایک علمی کام ہے جسمیں گہری نظر اور سچی جدوجہد اور کاوش کی ضرورت ہے، سب سے پہلے قرآن مجید کے مقامات پر عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیتوں اور سورتوں کے لفظی اور حالی مقامات یعنی قرائن اور سیاق وسباق پر نگاہ ڈالی جائے۔ استاذ دروزہ تحریر فرماتے ہیں: ''یقیناً قرآنی عبارتوں پر سیاق وسباق یا دونوں کی روشنی میں نگاہ ڈالی جائے تو وہم دور ہو جاتا ہے اور قرآنی معانی و مفاہیم اور ثابت کردہ حقائق ہم آہنگ نظر آتے ہیں''، دیکھئے: دروزہ، محمد عزہ، ''التفسیر الحدیث ترتیب السور حسب النزول''، بیروت، دار الغرب الاسلامی، ط:۲، (۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء) ج۱، ص: ۲۳۷۔ بعض اہل علم کے قول کے برعکس ہم اس تقاضے وضرورت کو ثابت کر رہے ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ ہر قرآنی خطاب وکلام کے اندر ربط ومناسبت کے پہلو سے آگاہ ہونا دشوار ہے۔ عز بن عبد السلام (المتوفی: ۶۶۰ھ) رقم طراز ہیں: ''قرآن کریم مختلف اسباب کے تحت مشروع مختلف احکام کے بارے میں بیس سال سے زائد عرصہ میں نازل ہوا، اور جس کی یہ شان ہو اسے ایک دوسرے سے مربوط نہیں کیا جا سکتا ہے'' دیکھئے: ابن عاشور، محمد طاہر، ''التحریر والتنویر''، تیونس: الدار التونسیۃ للنشر، (د،ت) ج۱، ص۱۱۶۔

۲- زرکشیؒ کے قول کے اندر اس امتیاز کا ہم مطالعہ کر سکتے ہیں: ''جب یہ بات جائز وممکن ہے کہ قرآن ہو اور اس پر عمل نہ کیا جائے۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا قرآن ہو جس پر عمل کیا جائے اور اس کی تلاوت نہ کی جائے، ایسا اس وجہ سے

اسی طرح قرآنی اصلاح سے متعلق بحث قرآنی واقعات وقصص کے مبحث سے بھی مربوط ہے، اس لئے کہ ان واقعات و حکایات کا مقصود بھی لوگوں کی اصلاح ہے؛ کیونکہ فرمان باری تعالی ہے: ''**نحن نقص علیک أحسن القصص**''(سورۂ یوسف:۳)(ہم اس قرآن کی وحی کے ذریعہ، تمہیں بہترین واقعات سنا رہے ہیں)۔

ارشاد الٰہی ''أحسن''(بہترین) سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآنی واقعات کے سلسلہ میں بہترین معیار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے اندر محض مزید اور دلچسپ باتیں بیان کی گئی ہیں، جن سے نشاط وچستی حاصل ہوتی ہے، بلکہ واقعات کے سلسلہ میں حسن وبہتری کا معیار یہ ہے کہ ان سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اور ان کے مختلف معاملات درست ہوں، کیونکہ واقعات سے آگاہی آگاہ ہونے والے کو اسباب پر مسببات ونتائج کے مرتب ہونے کے طریقہ سے باخبر کرتی ہے، خواہ یہ نتائج تعمیر وآبادی کے میدان میں ہو یا تخریب وبربادی کے میدان میں ہو۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**فتلک بیوتھم خاویة بما ظلموا**''(سورۂ نمل:۵۲)(وہ دیکھو ان کے گھر ان کے ظلم و بدمعاشیوں کی وجہ سے خالی پڑے ہیں)، یہ واقعات اپنے قاری کو عبرت حاصل کرنے کی خاطر قوموں کے حالات سے باخبر کرتے ہیں، نیز اس لئے باخبر کرتے ہیں کہ ایسے اسباق اور عبرتیں اخذ کی جائیں جو حال کے لئے مفید ہوں اور ان کے ذریعہ ہم مستقبل کے اطراف میں جھانک سکیں۔

اسی سیاق میں اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں نوح، عاد، ثمود اہل رس (کنواں والے) اور ''اصحاب ایکۃ''(بیان والے) کے واقعات بیان کئے ہیں، علماء اسلام کے نزدیک اصلاحی خطاب کی متعدد صورتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے اس کی اہمیت سمجھی، اور یہ اہمیت ایک مستحکم محرک بن گئی، جو اس بات کے لئے کافی ہے کہ اس کے ذریعہ قرآن مجید میں وارد اصلاح کے مفہوم،

ہے کہ یقیناً اللہ عزوجل کو ہمارے مصالح کا زیادہ علم ہے، اور یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالی کو علم ہو کہ ہماری مصلحت اس میں ہے کہ اس طریقہ کے ساتھ عمل مربوط ہو''، زرکشی، ابوعبداللہ بدرالدین محمد بن عبداللہ، ''البرہان فی علوم القرآن''، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم، قاہرہ، مکتبہ دارالتراث، ط:۳، (۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء) ج ۲، ص:۴۱۔

قرآنی خطاب، اس کی ساخت، اس کے اسباب اور متعدد مسائل میں ایک مسلمان عالم کے اہتمام کی وضاحت ہو سکے۔

چنانچہ قرآن کریم نے ''عمل صالح'' کو جس قدر بلند کیا ہے اس قدر اور کسی چیز کو بلند نہیں کیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ''**إليه يصعد الكلم الطيب والعمل الصلح يرفعه**'' (سورۂ فاطر:۱۰) (اچھی باتیں اسی کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہیں، اور نیک اعمال کو وہ بلند فرماتا ہے(۱)۔

قرآنی اصلاحی خطاب کی اہمیت کے پیش نظر بالعموم آدمی اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ تمام مصلحین اصلاح کے پرچم کو بلند کرنے اور اصلاحی سرگرمی کی دعوت دینے کے سلسلہ میں قرآن کریم کو محور بنانے کی دعوت دیتے ہیں؛ کیونکہ ہم ان کے کلام میں بہت سی ایسی آیتوں کا استحضار پاتے ہیں جو اصلاح پر بہ طور تاکید زور دیتی ہیں، اور اصلاح سے متصف ہونے کی دعوت

۱- کیونکہ اس آیت میں ''عمل صالح'' کو بلند فرمانے کی خبر جملہ ''یرفعہ'' (نیک عمل کو وہ بلند فرماتا ہے) کے ذریعہ وارد ہوئی ہے، اور اللہ تعالی کی طرف اٹھتے چلے جانے کے حکم کے سلسلہ میں ''کلم طیب'' (اچھی باتوں) پر اس کا عطف نہیں کیا گیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ اس دے دو فائدے حاصل ہوں، جن کو امام ابن عاشورؒ نے واضح فرمایا ہے: ''پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ کیا جائے کہ مجموعی اعتبار سے ''عمل صالح'' کی قسم ''کلم طیب'' (اچھی باتوں) کی قسم سے اہم ہے، اس لئے کہ زیادہ تر نیک عمل کا نفع زیادہ تر اچھی باتوں کے نفع سے بڑھ کر ہے، سوائے کلمہ شہادتین، اور ان اقوال کے جن کی فضیلت ''سنت'' میں وارد ہے، مثلاً: یوم عرفہ کی دعا۔ یہی وجہ ہے کہ خود اللہ تعالی کی طرف نیک عمل کو بلند فرمانے کی نسبت کی گئی ہے، جیسے: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو حلال کمائی سے صدقہ کرے گا، اور اللہ تعالی حلال کمائی ہی کو قبول فرماتا ہے، اسے رحمان اپنے دائیں ہاتھ میں لے گا، اور اس کے دونوں ہاتھ یمین (دایاں) ہیں، اللہ تعالی اس صدقہ میں اس طرح افزائش کرے گا، جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے کی پرورش و پرداخت کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ صدقہ پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اچھی باتیں فضا میں جذب ہو جاتی ہیں، لہذا اللہ تعالی کی طرف ان کے چڑھتے چلے جانے کی نسبت ان کی ماہیت کے مناسب ہے۔ جہاں تک کہ نیک عمل کا تعلق ہے تو وہ اپنے فاعل (کرنے والے) اور مفعول (جو کام کیا جائے) کی ذاتوں پر طاری ہونے والی کیفیات ہیں، لہذا اللہ عزوجل کی طرف اس کے چڑھتے چلے جانے کی نسبت مناسب نہیں ہے، (بلکہ) بہتر یہ ہے کہ اسے بلند فرمانے سے مربوط قرار دیا جائے، جو اس پر واقع ہو کر اسے بلند ہونے کے لئے مسخر کر دے، دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۲۲، ص: ۲۷۳۔

دیتی ہیں، اسی طرح ہم ان کے کلام میں اصلاح کی بعض ان تعریفوں کی موجودگی پاتے ہیں، جن کو قدیم مفسرین اور مصلحین نے پیش کیا ہے۔

میری نگاہ میں یہاں دو ایسی چیزیں ہیں جو موجودہ وقت میں اس اہمیت کو مستحکم کرتی ہیں، پہلی چیز یہ ہے کہ دنیا رابطہ کے وسائل اور ذرائع ابلاغ کی ترقی کی وجہ سے ایک ایسے ڈھانچہ میں تبدیل ہوگئی ہے، جس کے اجزاء وعناصر کے درمیان باہم ربط وتعاون پایا جاتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ گذشتہ دہائیوں اور صدیوں میں انسان کا علم جس حد کو پہنچا، اس کی بہ نسبت موجودہ انسانی علم نے سماج، انسان اور کائنات کو ترقی یافتہ علمی حد تک پہنچا دیا ہے۔ یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے انسانوں کے درمیان تعارف اور باہمی شناخت کو بہت ہی سہل اور آسان بنا دیا ہے۔

اس جگہ تعارف سے ہمارا مقصود فنی اور ٹیکنکل مفہوم نہیں ہے، جسے استاذ سیف الدین عبد الفتاح نے ''معلوماتی اور رابطہ پر مبنی چھلکے وقشور'' سے تشبیہ دی ہے(۱)، بلکہ اس سے ہماری مراد مسلسل باشعور ذہنی توسع اور کھلا پن ہے جو ہم سب کو اس بات پر آمادہ کرے کہ دنیا کے مختلف اطراف میں فساد و بگاڑ کی پھیلنے والی شکلوں پر ناقدانہ غور وفکر کریں اور ان کا سنجیدہ حل نکالیں، بالخصوص تشدد، بھکمری، دولت وثروت کی غیر منصفانہ تقسیم، ماحولیاتی آلودگی، کشمکش اور سرکشی کی صورت حال پر ناقدانہ غور وفکر کریں اور اس کا سنجیدہ ومناسب حل نکالیں.....۔

بنا بریں چونکہ ''تعارف'' دوسرے انسانوں کے انسانی اور تہذیبی سرمایہ کے سلسلہ میں توسع اور ذہنی کھلا پن اختیار کرنا ہے، لہذا یہ ان وسائل میں سے ایک ہے جن کا مطلوبہ صلاح و درستی کو وجود میں لانے کی خاطر طاقتوں کے باہمی تکامل کو وجود میں لانے میں حصہ ہے۔

لہذا ان دونوں چیزوں کا استعمال ضروری ہے، تاکہ لوگوں کے درمیان تعارف باہمی الفت ومحبت اور انسیت کی مصلحت کی خاطر ہو، نہ کہ باہمی نفرت وبیزاری کے فساد کی خاطر ہو،

۱- عبد الفتاح، سیف الدین، ''العولمۃ والإسلام رؤیتان للعالم''، دمشق، دار الفکر، ط:۱، ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء، ص:۱۱۳۔

فرمان باری تعالی ہے:"**يأيهاالناس إنا خلقناكم من ذكر وأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا**"(سورۂ حجرات:۱۳)(اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں خاندانوں اور قوموں میں تقسیم کیا تا کہ باہمی شناخت اور تعارف حاصل ہو)۔

ہم اس بحث میں اس فساد وصلاح ودرستگی کی چھان بین نہیں کر رہے ہیں جو روز آخرت میں قیامت کے دن رونما ہوں گے، جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے، اللہ تعالی صلاح اختیار کرنے والے یا احسان پسند کو اس کی صلاح اور احسان پسندی کا بدلہ دے گا۔ اور بگاڑ پیدا کرنے والے اور بدکاروں کو ان کے بگاڑ یا برائی کی سزا دے گا(۱)۔

۱- اگر یہ حساب وسزا کا دن نہ ہو تو انسانی اعمال فائدہ سے خالی ہو جائیں، بلکہ بسا اوقات دنیا میں بعض بدکار، نیکوکاروں سے بہتر حالت میں ہوں گے، اور یہ اس فائدہ کے برعکس ہے جو فرمان باری تعالی سے سمجھا جاتا ہے، ارشاد الہی ہے:"**وما خلقنا السماء والأرض وما بينهما باطلا، ذلك ظن الذين كفروا فويل للذين كفروا من النار، أم نجعل الذين آمنوا وعملوا الصالحات كالمفسدين في الأرض أم نجعل المتقين كالفجار**"(ص:۲۷-۲۸)(ہم نے آسمان اور زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ان کو بے فائدہ وعبث پیدا نہیں کیا ہے، یہ کافروں کا گمان ہے، سو کافروں کے لئے جہنم کی تباہی ہے۔ کیا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے زمین میں فساد وبگاڑ پیدا کرنے والوں کی طرح کر دیں گے، یا ہم پرہیزگاروں اور تقوی شعاروں کو بدکاروں اور فاجروں کی طرح کر دیں گے؟)، اسی وجہ سے حکمت الہی کا تقاضا ہوا کہ اعمال کی نوعیت کے لحاظ سے بدلہ یا سزا دی جائے، فرمان باری تعالی ہے:"**وعد الله حقا إنه يبدأ الخلق ثم يعيده ليجزي الذين آمنوا وعملوا الصالحات بالقسط والذين كفروا لهم شراب من حميم وعذاب أليم بما كانوا يكفرون**"(سورۂ یونس:۴)(یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے کہ وہ مخلوق کو پیدا کرے گا، پھر اسے دوبارہ زندہ کرے گا تا کہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے انصاف کے ساتھ بدلہ دے، اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے کھولتے پانی کا مشروب اور دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے۔

نیز فرمان باری تعالی ہے:"**ومن يؤمن بالله ويعمل صالحا يدخله جنات تجري من تحتها الأنهار خالدين فيها أبدا قد أحسن الله له رزقا**"(سورۂ طلاق:۱۱)(جو اللہ پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، انہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، وہ ہمیشہ ہمیش وہاں رہیں گے۔ اللہ نے ان کے لئے بہترین رزق کا انتظام کر رکھا ہے)، نیز فرمان باری تعالی ہے:"**جنات عدن يدخلونها ومن صلح من آبائهم وأزواجهم وذرياتهم**"(سورۂ رعد:۲۳)(وہ ہمیشگی کے باغات میں ان لوگوں کے ساتھ داخل ہوں گے جو ان کے آباء واجداد، بیویوں اور اولاد میں سے نیک وصالح ہوں گے)۔

ہرگز نہیں! یہ ہمارا مقصود نہیں ہے؛ کیونکہ اس جگہ ہمیں جس موضوع سے سروکار ہے، یہ وہ اصلاح و بگاڑ ہے جو ہماری اسی محدود دنیوی زندگی سے وابستہ ہیں جس کی ابتدا اور انتہا، زندگی اور موت اور جوانی اور بڑھاپا ہے۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے فرشتوں کے اشکال کو ان کے الفاظ میں: "**قالوا أتجعل فيها من يفسد فيها ويسفک الدماء**" (سورۂ بقرہ:۳۰) (انہوں نے عرض کیا تھا: کیا آپ اس کو یہ ذمہ داری سونپ رہے ہیں جو زمین میں فساد مچائے گا، اور خون بہائے گا)۔

تعجب اور حیرت کے انداز میں استفہام کے طور پر پیش کیا ہے(۱)۔

اس سیاق کے پیش نظر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ فرشتے جان رہے تھے کہ زمین اور اس کے نظام کی تخلیق سے اللہ عزوجل کا مقصد اس کی آبادی اور اصلاح ہے، اللہ سبحانہ وتعالی کا مقصود اس کی بربادی اور بگاڑ نہیں ہے، اس تنبیہ کو ہم مضبوطی سے تھام لیں؛ اس لئے کہ اپنے دنیوی اعمال

''ومن صلح'' میں واو معیت کا ہے جس سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالی جنتیوں کے آباء واجداد، اولاد اور بیویوں میں سے جو اپنی صلاح کی وجہ سے جنت میں داخل ہونے کے اہل ہوں گے ان کو اسی درجہ میں رکھے گا جس میں وہ جنتی ہوں گے، چنانچہ جن کا درجہ ان سے کم ہوگا وہ بھی ان سے جاملیں گے، اور جن کا درجہ ان سے بڑھ کر ہوگا وہ ان سے جاملیں گے۔ دونوں حالتوں میں ان کے لئے زائد درجہ ہے۔ اس کے برعکس مجرموں کے ساتھ ہوگا، ارشاد الٰہی ہے: "**احشروا الذين ظلموا وأزواجهم**....." (سورۂ صافات:۲۲) (ظالموں اور ان کی بیویوں کو اکٹھا کرو.....) اس کی وجہ یہ ہے کہ رشتہ داروں کے عذاب کا مشاہدہ عذاب کو دوچند کر دیتا ہے۔ ان اثرات کے دائرہ میں ہم فرمان باری تعالی میں وارد خوشخبری کو سمجھ سکتے ہیں: "**والذين آمنوا واتبعتهم ذرياتهم بإيمان ألحقنا بهم ذرياتهم وما ألتناهم من عملهم من شيء**" (سورۂ طور:۲۱) (جو ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان لے آئی، ہم ان کے ساتھ ان کی اولاد کو بھی ملا دیں گے، اور ہم ان کے عمل میں سے کچھ کم نہیں کریں گے) دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۱۳، ص: ۱۳۱-۱۳۲۔

۱- اس جگہ فرشتوں کا موقف اسکالر کے موقف کی مانند ہے۔ اس موقف کو بحث وتحقیق کے آداب کے علم کے اندر ''اعتراض واشکال'' سے ملقب کیا جاتا ہے، جو اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ بحث کی جارہی ہے وہ اپنے طریقہ کے برخلاف ہے یا اس طریقہ کے برخلاف ہے جو عقلاء کے نزدیک مقرر ہے، ابن عاشور، محمد طاہر، ''اصول النظام الاجتماعی فی الإسلام''، تیونس، الشرکۃ التونسیۃ للتوزیع، ۱۹۷۷ء، ص: ۴۱، ۴۲۔

کی اصلاح کا اہتمام فقہ کی قسموں میں سے ایک قسم ہے، جس سے دنیوی زندگی کی حقارت کے دعوی کی بنا پر مسلمان بہ کثرت غفلت کے شکار ہیں، چنانچہ وہ دنیوی اعمال کی اصلاح کو نظر انداز کرنے کی خرابی میں مبتلا ہیں(۱)۔

۱- اس عملی مفہوم کو خاطر میں لانا مسلمانوں کی کامیابی کے بڑے اسباب میں سے ہے، امام ابن عاشورؒ نے کیا خوب تحریر فرمایا ہے: ''یہاں تک کہ جب مسلمان گفتار کے غازی بن گئے، توہمات سے وابستہ ہوگئے، مسببات اور نتائج کو ان کے اسباب کے بغیر طلب کیا اور گھروں میں دروازوں کی بجائے ان کی چھتوں اور پچھواڑوں سے داخل ہونے لگے، تو ان کی حالت وہ ہوگئی جس کا مشاہدہ تم کر رہے ہو، اور بہ طور کہاوت، محاورہ اور مثال استعمال ہونے والا شعر ان پر صادق آ گیا ہے:

تم نجات کے امیدوار ہو، حالانکہ تم اس کی راہوں پر نہیں چلے، یقیناً کشتی خشکی پر نہیں چلتی ہے۔

یہ شعر نیک، صالحہ، اور عبادت گزار رابعہ عدویہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، ابن عاشور نے اس کی صراحت کی ہے، دیکھئے: ابن عاشور، ''أصول النظام الاجتماعی فی الإسلام''، مرجع سابق، ص۵۹-۶۰۔

اس شعر کو ابو العتاہیہ کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے، ابو العتاہیہؒ سے منقول ہے کہ وہ ایک دن ہارون رشید کے پاس گئے، ہارون رشید نے ان سے کہا کہ مجھے شعر سنایئے، انہوں نے عرض کیا: مجھے امان دیجئے، ہارون نے کہا: تجھے امان حاصل ہے، تب انہوں نے اشعار سنائے، سنائے گئے اشعار میں درج ذیل اشعار بھی تھے:

''مابال دینک ترضی أن تدنسه

وثوبک الدهر مغسول من الدنس

تمہارے دین کو کیا ہوا کہ تم اسے آلودہ کرنے پر راضی ہو

حالانکہ تمہارا کپڑا ہمیشہ میل کچیل سے دھلا ہوا اور صاف رہتا ہے

''ترجو النجاة ولم تسلک مسالکها

إن السفينة لا تجري علی اليبس''

تم نجات کے امیدوار ہو، حالانکہ تم اس کی راہوں پر نہیں چلے

یقیناً کشتی خشکی پر نہیں چلتی ہے۔

دیکھئے: ابن الجوزی، ''بستان الواعظین ورياض السامعين''، تحقیق: ایمن بحیری، بیروت، لبنان، مؤسسة الكتب الثقافية، ط:۲، (۱۴۱۷ھ/۱۹۹۸ء)، ص:۱۶۶-۱۶۷، اس پہلو پر ہماری درج ذیل کتاب کا مطالعہ بھی مفید ہوگا: حسنی اسماعیل، ''مقاصد الشريعة وأسئلة الفكر المقاصدي دراسة في أسئلة التدقيق المصلحي والتوظيف المنهجي''، رباط، منشورات الرابطة المحمدية، ط:۱، ۲۰۱۳ء، الفصل الأول الموسوم بالموضوع المصلحي بين التعميم الاعتقادي والتدقيق العلمي، ص:۲۳۔

قرآن مجید میں وارد اصلاح اور قرآنی سورتوں اور آیتوں میں مضمر اصلاح کے بارے میں غور وفکر کرنا، اس قدر عمیق ہے جو دو باہم لازم وملزوم ایسے تفصیلی سوالات سے قریب ہے کہ ایک کے جواب سے دوسرے سوال کے جواب سے بے نیازی حاصل نہیں ہوسکتی ہے:

پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن مجید میں وارد اصلاح کو ہم منہجی طریقہ پر کس طرح سمجھیں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں وارد اصلاح کو امت اور ہر سماج پر ہر دور اور ہر جگہ میں کس طرح منطبق کریں؟

اس کے باوجود کہ دوسرا سوال وقیع ہے، لیکن اس سے قبل پہلا سوال آتا ہے؛ اسی وجہ سے ہم نے اس موقع پر پہلے سوال کے حل سے آغاز کیا ہے، تو کیا ہم لغوی تجزیہ کے طور پر قرآنی اصلاح کو حاصل کر پائیں گے یا منہجی طور پر اسے تھام سکیں گے؟

مبحث دوم

اصلاح کے مفہوم کے لغوی تجزیہ کے حدود

جواب کے سلسلے میں ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ ہم عربی زبان کے اندر ''صلاح'' اور ''فساد'' کے مادہ کے متعدد اہم استعمالات کی ایک جھلک پیش کریں، شروع میں ہی ہم اس بات سے باخبر کردینا چاہتے ہیں کہ لفظ ''صلح'' اور اس کے مشتقات قرآن مجید میں تقریبا 180 مرتبہ وارد ہوئے ہیں، عرب بولتے ہیں: ''**أصلح الشيء**'' (یعنی اس نے اس کو درست کردیا)، اسی بنا پر دو جھگڑا کرنے والے فریقوں کے درمیان صلح کرانے پر بھی ''اصلاح'' کا اطلاق کیا جاتا ہے؛ کیونکہ صلح کرانے والا ان کو بگاڑ کے بعد درست کردیتا ہے، جس سے دلوں میں الفت ومحبت پیدا ہوجاتی ہے، فرمان باری تعالی ہے: ''**وألف بين قلوبهم لوانفقت ما فى الأرض جميعا ما الفت بين قلوبهم ولكن الله ألف بينهم إنه عزيز حكيم**'' (سورۂ انفال: ۶۳) (اور ان کے دل ایک دوسرے سے ملا دیئے، اگر تم روئے زمین پر جو کچھ بھی ہے سب خرچ کرکے (ان کے دل ملانے کی کوشش کرتے) تو ان کے دلوں میں الفت ومحبت نہیں پیدا کرسکتے تھے؛ لیکن اللہ نے ان میں الفت ومحبت پیدا کردی، وہ صاحب اقتدار اور حکمت والا ہے)، اگر ہم کسی انسان کی طرف صلاح کی نسبت کریں گے، مثلاً: ''**الانسان الصالح**'' بولیں گے، تو ہماری مراد اس سے صادر ہونے والے اچھے اقوال و اعمال ہوں گے، بہرحال ''صالح اور نیک انسان'' وہ لوگ ہیں جن سے صلاح ونیکی صفت جدا نہ ہو، اسی طرح اگر ہم ''صلاح'' یا ''اصلاح'' کی نسبت اشیاء اور چیزوں کی طرف کریں گے تو ہماری مراد ان پر مرتب ہونے والے اچھے نتائج

ہوں گے، جیسے: ہم بولتے ہیں: ''**المال الصالح**'' تو اس سے ہماری مراد وہ مال ہوتا ہے جس پر اچھے اثرات ونتائج مرتب ہوں۔

اگر ہم ''صلاح'' کی نسبت عمل کی طرف کریں گے، مثلاً:۔''**العمل الصالح**'' بولیں گے تو ہمارا مقصود وہ عمل ہوگا جو دین اسلام کی تعلیمات وہدایات کے مطابق ہو، فرمان باری تعالی میں اس کی طرف اشارہ ہے :''**ومن أحسن قولاً ممن دعا إلى الله وعمل صلحا وقال: إنني من المسلمين**'' (سورۂ فصلت: ۳۳) (اور اس سے بہتر بات کس کی ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے، اور کہے کہ میں اطاعت شعار اور فرمانبردار ہوں)، ابن عاشور نے اپنے الفاظ میں ''عمل صالح'' کی اس طرح تعریف کی ہے: ''وہ عمل جو اپنے کرنے والے کو دین ودنیا میں اس طرح درست رکھے کہ اس میں فساد وبگاڑ شامل نہ ہو، اور یہ وہ عمل ہے جو دینی تعلیمات وہدایات کے مطابق ہو''(۱)۔

عربی زبان کا لفظ ''الصالحات'' ''صالحۃ'' کی جمع ہے، اس کا معنی اچھی خصلت یا اچھا عمل ہے، یعنی وہ خصلت یا عمل جو صلاح سے متصف ہو، اس لئے کہ عرب ''صالحۃ'' اور ''حسنۃ'' (نیکی) بولتے ہیں، اور موصوف کو محذوف نہیں مانتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ ''الصالحات'' ''صالحۃ'' کی جمع ہے، ایسی خصلت اور عمل کو کہتے ہیں جو صلاح سے متصف ہو، ''الصالحات'' میں ''الف لام'' استغراق واحاطہ کرنے کے لئے ہے، یعنی تمام نیک خصلتیں اور اعمال جن میں صفت صلاح موجود ہو، نیک اعمال کو انجام دینے کے ایسے اسباب ہیں جن میں تمام لوگ برابر ہیں، ان میں عظیم تر اسباب عدل وانصاف، احسان وبھلائی، مواسات وغمخواری اور ظلم وزیادتی سے نفرت کے اصولوں کی رعایت ہے(۲)۔

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۲۴، ص: ۲۲۹۔

۲- حطیئہ شاعر کہتا ہے: ''**كيف الهجاء وماتنفك صالحة—من آل لأم بظهر الغيب تأتي**'' (کیسے ہجو گوئی ہوسکتی ہے؟ حالانکہ خاندان ''لأم'' سے نیک خصلت جدا نہیں ہوتی ہے، اور غائبانہ بھی ان کی نیک خصلت (کا فائدہ) مجھے پہنچتا رہتا ہے۔

یقیناً ''اصلاح'' کسی چیز کو درست کر دینے کا نام ہے، یعنی صلاح و نیکی پر مبنی کر دینے کا نام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز ایسی حالت میں ہو جائے کہ اس کی وجہ سے مطلوبہ شئ آخری و کامل درجہ میں حاصل ہو، اس کو ''اصلاح'' کہتے ہیں۔

''اصلاح'' کی ضد ''افساد'' ہے(۱)۔ جس طرح ''صلاح'' کی ضد ''فساد'' (بگاڑ) ہے، ''فاء، سین اور دال'' ایک کلمہ ہے، عرب بولتے ہیں: ''**فسد الشيء يفسد فسادًا و فسودًا**'' (کسی چیز کا بگڑ جانا، بگاڑ کا شکار ہونا)، ''فاسد'' اور ''فسید'' (بگڑنے والے اور بگاڑ کے شکار کو کہتے ہیں)(۲)، ''قوم فسدی'' کا مطلب ہوتا ہے بگڑے ہوئے لوگ۔ جیسے: عرب ''ساقط'' (گرنے والا) اور ''سقطی'' (گرے ہوئے لوگ) بولتے ہیں۔ سیبویہؒ فرماتے ہیں: ''**هلكى**'' (ہلاک ہونے والے لوگ) کی طرح اس کی جمع لائی گئی ہے؛ کیونکہ دونوں معنی و مفہوم کے اعتبار سے قریب ہیں، ''تفاسد القوم'' کا مطلب ہے: لوگوں نے باہم قطع تعلق کیا اور قطع رحمی کے شکار ہوئے۔ ''مفسدہ'' ''مصلحت'' کی ضد ہے۔ ''استفساد'' (بگاڑ چاہنا)، ''استصلاح'' (صلاح چاہنا) کی ضد ہے۔ عرب استعمال کرتے ہیں: ''**هذا الأمر مفسدة لكذا**'' (اس معاملہ میں فلاں چیز کے لئے فساد و بگاڑ ہے)، ''**أفسد الشيء**'' کے معنی ہیں: اس

۱- اس بات کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ''فسد'' کا مادہ اختیار کیا ہے، اس کے باوجود کہ اصلاح کا قرآن کریم میں صرف افساد سے مقابلہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ''سیئات'' (برائیوں) سے بھی اس کا مقابلہ کیا گیا، جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے: ''**خلطوا عملا صالحا و آخر سيئا**'' (سورۂ توبہ:۱۰۲) (دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اعمال صالحہ کے ساتھ کچھ برائیاں بھی ملا رکھی ہیں)۔

اس آیت میں برے عمل سے مراد فاسد عمل یا برائی ہے، جیسے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کے قول میں ''شر'' سے مراد فتنہ و فساد اور برائی ہے، وہ کہتے ہیں: ''لوگ نبی کریم ﷺ سے خیر و نکی کے بارے پوچھتے تھے، اور میں آپ ﷺ سے ''شر و برائی'' کے بارے میں پوچھتا تھا کہ مبادا مجھے آ نہ لے''۔

بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، منصورہ: دار ابن رجب، ط:۱، (۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء)، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ في الإسلام، حدیث نمبر: ۳۶۰۶۔

۲- ابن فارس، ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا، معجم مقاییس اللغۃ، تحقیق: عبد السلام محمد ہارون، بیروت: دار الجیل، (۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء)، ج ۴، ص: ۵۰۴۔

نے اس چیز کو بگاڑ دیا یا ہلاک وتباہ کر دیا۔

''فساد'' کسی شے کا اعتدال سے نکل جانا ہے، خواہ اعتدال سے نکلنا کم ہو یا زیادہ۔ ''فساد'' کی ضد ''صلاح'' ہے(۱)۔

بعض اہل علم یہ کہتے ہیں کہ: ''فساد'' بر وبحر (خشکی وسمندر) میں قحط وخشک سالی کو کہتے ہیں۔ انہوں نے فرمان باری تعالی کی وجہ سے ایسا کہا ہے: ''**ظهر الفساد في البر والبحر**'' (سورۂ روم:۴۱) (خشکی اور تری میں لوگوں کے کرتوتوں کی بنا پر فساد، بگاڑ اور کرپشن غالب آچکا ہے)۔ ''فساد'' کے مادہ سے قرآن میں استعمال ہونے والے مفردات والفاظ پچاس (۵۰) ہیں۔ اسی طرح متعدد صیغوں کی شکل میں یہ مادہ استعمال ہوا ہے:

۱- پہلی شکل: فعل ماضی کا صیغہ ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''**ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض**'' (سورۂ بقرہ:۲۵۱) (اگر اللہ تعالی لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ٹکرائے (حق و باطل کا معرکہ نہ ہو) تو روئے زمین پر فساد پھیل جائے)، نیز فرمان الٰہی ہے: ''**لو كان فيهما الهة إلا الله لفسدتا**'' (سورۂ انبیاء:۲۲) (اگر آسمان وزمین میں اللہ کے علاوہ دیگر خدا ہوتے، تو دونوں درہم برہم ہوجاتے)، اسی طرح ارشاد الٰہی ہے: ''**ولو اتبع الحق أهواء هم لفسدت السموات والأرض ومن فيهن**'' (سورۂ مومنون:۷۱) (اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا، تو آسمانوں اور زمین اور ان میں جو بھی ہیں سب تباہ ہوجاتے)، نیز ارشاد باری تعالی ہے: ''**قالت :إن الملوک إذا دخلوا قرية أفسدوها وجعلوا أعزة أهلها أذلة، وكذلک يفعلون**'' (سورۂ نمل:۳۴) (ملکہ نے کہا: کہ بادشاہ جب کسی علاقہ (شہر وقریہ) میں داخل ہوتے ہیں، تو اسے بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں، اور اس کے باعزت اور اہل وجاہت لوگوں کو ذلیل وکمزور کر دیتے ہیں، اور یہ بھی ایسا ہی کریں گے)۔

۱- راغب اصفہانی، ابوالقاسم حسین بن محمد، ''مفردات الفاظ القرآن''، تحقیق: صفوان عدنان داوودی، دمشق: دارالقلم، ط:۳، ۲۰۰۲ء، ص:۶۳۶۔

۲-دوسری شکل:فعل مضارع کا صیغہ ہے، فرمان باری تعالی ہے:"**قالوا أتجعل فيها من يفسد فيها**"(سورۂ بقرہ:۳۰)(انہوں نے عرض کیا تھا: کیا آپ اس کو یہ ذمہ داری سونپ رہے ہیں جو زمین میں فساد مچائے گا)۔نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**وإذا تولى سعى في الأرض ليفسدفيها**"(سورۂ بقرہ:۲۰۵)(وہ جب سامنے سے ہٹتے ہیں تو علاقہ میں ان کی تک و دو،فساد و بگاڑ کے لئے ہوتی ہے)، نیز ارشاد باری تعالی ہے:"**ما جئنا لنفسد في الأرض وما كنا سارقين**"(سورۂ یوسف:۷۳)(ہم لوگ فتنہ وفساد کے لئے نہیں آئے، اور ہم چور نہیں ہیں)۔

۳-تیسری شکل:اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:"**والله يعلم المفسد من المصلح**"(سورۂ بقرہ:۲۲۰)(اور اللہ جانتا ہی ہے کہ کون بگاڑ چاہتا ہے اور کون اصلاح چاہتا ہے)،اللہ رب العزت کا فرمان ہے:"**كلوا واشربوا من رزق الله ولا تعثوا في الأرض مفسدين**"(سورۂ بقرہ:۶۰)(اللہ کی عطاؤں سے (فائدہ اٹھاؤ)،کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد وبگاڑ پھیلاتے مت پھرو)، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**ءآلئن وقد عصيت قبل وكنت من المفسدين**"(سورۂ یونس:۹۱)(اب ایمان لاتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے نافرمانیاں کرتا رہا، اور فساد مچاتا رہا)، نیز اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے:"**أم نجعل الذين آمنوا وعملوا الصالحات كالمفسدين فى الأرض أم نجعل المتقين كالفجار**"(سورۂ ص:۲۸)(کیا ہم ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو، زمین میں فساد برپا کرنے والوں اور بگاڑ پھیلانے والوں کی طرح قرار دیں گے؟ یا ہم متقیوں کو فاجروں کی طرح سمجھیں گے؟)۔

۴-چوتھی شکل: مصدر کا صیغہ ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:"**فلولا كان من القرون من قبلكم أولوا بقية ينهون عن الفساد في الأرض إلا قليلا ممن أنجينا منهم واتبع الذين ظلموا ما أترفوا فيه وكانوا مجرمين**"(سورۂ ہود:۱۱۶)(تم سے پہلے جو نسلیں گذر چکیں ان میں ایسے لوگ کیوں نہیں ہوئے (جن کے پاس کچھ غیرت وحمیت ہوتی

اور)وہ زمین میں فساد، بگاڑ اور کرپشن سے روکتے، ہاں کچھ لوگ برائے نام تھے، جن کو ہم نے اپنے عذاب سے بچایا، اور ظالم اپنی عیاشیوں میں لگے رہے، اور وہ مجرم لوگ تھے)، نیز فرمان باری تعالی ہے:"**وأحسن كما أحسن الله إليك، ولا تبغ الفساد في الأرض إن الله لا يحب المفسدين**" (سورۂ قصص:۷۷)(اور اچھا معاملہ کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کر رکھا ہے، اور زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو، اللہ تعالی فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

''صلاح''اور''فساد'' کے مادہ کے اہم ترین لغوی استعمالات کے بیان سے یہ بات واضح ہے کہ لغوی تجزیہ ہمارے سامنے ایسے حقائق پیش کرتا ہے جن میں قرآن مجید میں وارد''صلاح''اور''فساد'' کے مادہ کے استعمالات کے متعدد لغوی صیغے شامل ہیں، اسی طرح معانی ومفاہیم کا وہ مجموعہ بھی شامل ہے جس کے ارگرد وہ صیغے مرکوز ہیں۔ مادہ''صلاح'' کے لحاظ سے یہ مثبت معانی ومفاہیم ہیں جن میں نمایاں تر معانی بہ طور مثال، نہ کہ بطور حصر:۱-جھگڑنے والے فریقوں کے درمیان اصلاح کرنا، ۲-دو مقدمہ لانے والے فریقوں کے درمیان عدل کرنا، ۳-لوگوں کے ساتھ ہمدردی وغمخواری کرنا اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، ۴-درست بات کہنا، ۵-اعمال، اثرات اور نتائج کو منضبط کرنا، ہیں۔ جبکہ مادہ''فساد'' کے اعتبار سے یہ منفی معانی ہیں، جن میں نمایاں تر معانی -بہ طور مثال، نہ کہ بہ طور حصر:۱-برائیوں کا ارتکاب، ۲-تخریب کاری وتباہی، ۳-ذلیل وخوار کرنا، ۴-تکبر وگھمنڈ کا شکار ہونا، ۵-حقوق کو ضائع کرنا، ہیں۔

اصلاح کا لغوی تجزیہ اہم اور مفید ہے، ایک اسکالر اور محقق کے لئے اس سے تجاوز کرنا ممکن نہیں ہے؛ کیونکہ اس سے محقق کو مثبت یا منفی معانی ومفاہیم کے ایک مجموعہ سے واقفیت ہوتی ہے جس پر یہ لفظ دلالت کرتا ہے۔ ہاں، اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اس سے قرآنی خطاب میں وارد اصلاح کے مظاہر کے قالب کو منہجی طور پر تھامے رہنے کی طرف ہماری رسائی نہیں ہوتی

ہے، اسی طرح اس سے ہم ان اسباب کا احاطہ کرنے پر بھی قادر نہیں ہوتے ہیں جو اصلاح کو پیدا کرتے ہیں اور اسے نمایاں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لغوی تجزیہ محدود ہے، اس لئے کہ اس سے ہمیں تعلقات کے اس جال و بندھن و شیرازہ کا احاطہ کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہوتی ہے، جس سے قرآنی اصلاحی خطاب کے مظاہر مربوط ہوں، اور اصلاح کے ڈھانچہ کے علمی مفہوم کی تعمیر و تشکیل میں مضبوط درجہ میں حصہ لے، ایسے ہی ''صلاح'' و ''فساد'' کے مادہ کا لغوی تجزیہ بھی محدود ہے؛ کیونکہ اس سے تعلقات کی ان صورتوں کو واضح و نمایاں کرنے میں مدد نہیں ملتی ہے، جو عبادت کی قسم کے قرآنی مفردات و الفاظ میں شامل دیگر موضوعات کے ساتھ اصلاحی خطاب کو مستحکم درجہ میں مربوط کریں۔ جیسا کہ یہ حقیقت فرمان باری تعالی میں عیاں ہے: ''**وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون**'' (سورۂ ذاریات:۵۶) (میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں)۔

یا جو آبادی، یا آبادکاری یا تعمیر و آباد کرنے کے قبیل کے قرآنی الفاظ میں شامل دیگر موضوعات کے ساتھ اصلاحی خطاب کو قوی درجہ میں مربوط کریں، جیسا کہ فرمان باری تعالی میں مذکور ہے: ''**واستعمركم فيها**'' (سورۂ ہود:۶۱) (اور اس نے زمین میں تمہیں آباد کیا)۔

مبحث سوم

اصلاح کا مفہوم اور اس کے اسباب ومظاہر کے شعور کا فقدان

بعض اہل علم نے عمومی طور پر اصلاح کے مفہوم اور خصوصی طور پر قرآنی اصلاح کے مفہوم کے تعین کی کوشش کی ہے۔ ایک رائے کے مطابق اصلاح محض ''امر بالمعروف'' (نیکی کا حکم دینے) اور ''نہی عن المنکر'' (برائی سے روکنے) کا نام ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ رقم طراز ہیں: ''اصلاح''، ''امر بالمعروف'' (نیکی کا حکم دینے) اور ''نہی عن المنکر'' (برائی سے باز رکھنے) کے ذریعہ بندوں کو درست رکھنے کا نام ہے؛ کیونکہ دنیا اور بندوں کی درستگی اللہ تعالی اور اس کے رسول کی اطاعت میں ہے، جس کی تکمیل امر بالمعروف (نیکی کا حکم دینے) اور ''نہی عن المنکر'' (برائی سے منع کرنے) کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے، اسی کی وجہ سے یہ ملت بہترین امت ہوئی ہے، جو لوگوں کے لئے برپا کی گئی ہے''(۱)۔

ایک دوسرے قول کے مطابق: ''اصلاح'': مناسب چیزوں کو انجام دینے، اور نامناسب باتوں سے احتراز کرنے کی طرف متوجہ ہونے کا نام ہے۔ علامہ آلوسیؒ (المتوفی: ۱۲۷۰ھ) تحریر فرماتے ہیں: ''صلاح ودرستگی'' مناسب امور کو انجام دینے اور نامناسب باتوں سے بچنے کا نام ہے۔ اس کا اطلاق تفاوت درجات کے ساتھ ہوتا ہے، لہذا اس سے بلندترین درجہ، جیسے انبیاء کے درجات کو بھی متصف کیا جاسکتا ہے''(۲)۔

۱- حرانی، تقی الدین احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ، ''السیاسۃ الشرعیۃ في إصلاح الراعي والرعیۃ''، تحقیق: علی بن محمد عمران، جدہ وریاض: المجمع العالمي للفقہ الإسلامی، ودار عالم الفوائد للنشر، ۱۴۲۹ھ، ص: ۹۴۔

۲- آلوسی، شہاب الدین محمود، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع الثانی، بیروت، دار الفکر (۱۳۹۸ھ/

ایک قول کے مطابق ''اصلاح'': دین پر مکمل طور پر استقامت اختیار کرنے کا نام ہے، امام ابن عاشورؒ سپرد قرطاس فرماتے ہیں: ''صلاح: دین حق پر مکمل طور پر استقامت اختیار کرنے کا نام ہے''(۱)۔

ایک قول کے مطابق ''اصلاح'' ایک مسلسل غیر تکمیلی عمل کا نام ہے، یا اس عمل کا نام ہے، جو مسلسل ہو، مستقبل میں بھی جاری رہے، اور انسانی زندگی کی نئی صورت حال کے حقائق اور معاملات میں بھی رواں دواں رہے، اسی پس منظر میں استاذ عبدالقادر حامد تیجانی نے درج ذیل الفاظ میں ''اصلاح'' کے مفہوم کو متعین کیا ہے: ''عادلانہ سماجی نظام قائم کرنے کی مسلسل جدوجہد اور کاوش، نیز اسے تحفظ فراہم کرنے اور ترقی دینے کی متواتر سعی وعمل میں شامل ہونے کا نام ''اصلاح'' ہے(۲)۔

ایک قول کے مطابق ''اصلاح'': ایمان اور طاعتوں پر عمل کرنے کا نام ہے، جبکہ ''فساد'' اس کا مقابل ہے جو کہ ''کفر اور معصیت پر عمل کرنے کا نام ہے''، جیسا کہ امام طبریؒ کا قول ہے(۳)۔

ایک قول کے مطابق: ''اصلاح'' اعتدال اور استقامت کی حالت پر ثابت قدم رہنے کا نام ہے، جہاں تک ''فساد'' کا تعلق ہے تو وہ ''اعتدال اور استقامت کی حالت سے باہر ہوجانے کا نام ہے''۔ یہ ابوحیان توحیدیؒ کا قول ہے(۴)۔

استاذ احمد عبادی کی رائے ہے کہ ''اصلاح'' ایک ذریعہ یا مہارت ہے، جس کا اپنا

۱۹۸۷ء)، ج۷ر ص: ۲۱۴۔

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۱۴ر ص: ۳۱۷۔

۲- تیجانی، عبد القادر حامد، الاصلاح فی القرآن: استکشاف المفہوم وبناء النظریۃ، مجلۃ اسلامیۃ المعرفۃ، شمارہ ۶۶، ۲۰۱۱ء۔ اس مجلّہ کی ویب سائٹ سے ماخوذ۔

۳- طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، ''جامع البیان عن تأویل ای القرآن''، تحقیق: عبداللہ ترکی، قاہرہ، ہجر للطباعۃ والنشر (۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء)، ج۱، ص: ۹۷۔

۴- ابوحیان اندلسی، محمد بن یوسف، ''تفسیر البحر المحیط''، بیروت، دار الفکر للطباعۃ والنشر، ۱۹۸۳ء، ج۱، ص: ۱۹۱۔

ڈھانچہ، مظہر وشکل اور عناصر ہیں۔ اس کا قالب: ''اس فطرت کی صفائی اور ستھرائی ہے جو کائنات اور انسان سے ہم آہنگ ہے''۔ اس کے مظہر کی نمایاں صورت یہ ہے کہ وہ انسان کی پوزیشن کی لازم کردہ سرگرمی کے ساتھ مناسب رخ کو مربوط کردیتی ہے، تاکہ قبلہ کی طرف اس کا رخ ہوجائے۔ انسان کے حق میں قرآن کریم میں وارد نیکیوں کی انجام دہی دائمی ہونی چاہئے، جب تک اس کی زندگی قائم ہے: ارشاد باری تعالی ہے:''**واعبدربک حتی یأتیک الیقین**''(سورۂ حجر:۹۹)(اور جب تک یقینی فیصلہ (موت) نہ آجائے اپنے رب کی بندگی کرتے رہیں)۔

بہرحال ''صلاح'' کے عناصر کی تین باہم معاون عناصر میں جلوہ گری ہوتی ہے۔ پہلا عنصر یہ ہے کہ انسان صحیح رخ کو پہچان لے۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ انسان مخصوص مقدار میں مخصوص عمل کی طرف خاص مقدار کے ساتھ خاص زمانے میں اس رخ کو پھیر دے۔ عنصر سوم قبلہ ہے یعنی عبادت کے ساتھ اللہ عزوجل کی طرف رخ کرنے کی نیت کرے۔ یہ سب کے سب ایسے عناصر ہیں جو ''انسان صالح'' کی اس قدرت کے ساتھ مربوط ہیں کہ وہ باہم دریافت کرنے کی طاقت کو اس سمت کی طرف پھیر دے جو عمل اور عبادت کو مربوط کردے۔

بنابریں استاذ عبادی کے قول کے مطابق- گذشتہ تینوں عناصر کی روشنی میں ''انسان صالح'' وہ ہے: جو اپنے علم کی بنا پر یا اگر علم نہ رکھتا ہو تو ارشاد الٰہی کے مطابق ''**فسئلوا أهل الذكر**''(سورۂ نحل:۴۳)(تو ان سے پوچھ لو، جن کو علم ہے)۔ اہل علم سے دریافت کرنے کی وجہ سے اس بات پر قادر ہو کہ اپنے قبلہ، اپنے فرض منصبی اور اپنے رشد وہدایت کے منبع وسرچشمہ کے دائمی شعور کی بنا پر اپنی سرگرمیوں میں اس علم کا اضافہ کرے.....اس طرح کہ تلاوت کے قصد میں اس سرچشمہ کو ترتین کے ساتھ گویا کرے۔ (تلاوت سے مؤلف کا مقصود کتاب الٰہی کی آیتوں اور روشن ہدایات وتعلیمات کی پیروی ہے)۔

اس ''صالح ومصلح انسان'' کو اس طرح بنایا جاسکتا ہے کہ کائنات کے سلسلہ میں انسان

کے تصورات، اور اللہ تعالی، کائنات، انسان، دنیوی زندگی اور آخرت کے ساتھ اس کے تعلقات کو منضبط کیا جائے (۱)۔

ان تعریفات کرنے والوں کے پاس ہم کوئی ایسی چیز نہیں پاتے ہیں جو اصلاح، اس کی ساخت اور مظاہر کے اسباب کے شعور کے لئے کافی ہو۔

بہ الفاظ دیگر: یہ ایسی تعریفات ہیں کہ ان میں سے ہر ایک تعریف قرآن مجید میں وارد اصلاح کے تفصیلی پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو سے بحث کرتی ہے اور اس پر روشنی ڈالتی ہے، چنانچہ ''امر بالمعروف'' (نیکی و بھلائی کا حکم دینا) اور ''نہی عن المنکر'' (برائی و بدی سے روکنا) ان اسلامی فرائض میں سے ہیں جن پر قرآنی اصلاح قائم ہے، لیکن یہ دونوں تنہا قرآنی اصلاح کی حقیقت و ماہیت اور اجزاء و عناصر کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں۔

اسی طرح مناسب باتوں کی طرف رخ کرنا، اگرچہ ''اصلاح'' کے قصد کے اندر اساسی حیثیت رکھتا ہے، تاکہ ''اصلاح'' کی تحصیل ہو اور اس کی مخالف صورت کا ازالہ ہو، لیکن جن امور کی انجام دہی مناسب ہے یا جن باتوں سے بچنا مناسب ہے، ان کی فطرت اور حقیقت کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی اس رائے کے مطابق کہ ''اصلاح'' دین پر مکمل طور پر استقامت اختیار کرنے کا نام ہے، اس سے ''قرآنی اصلاح'' کی آخری منزل اور مقصود کی وضاحت ہوتی ہے، لیکن اس میں اس آخری منزل و مقصود تک پہنچانے والے اجزاء و عناصر کی ضرورت ہے۔

تسلسل کے ساتھ اصلاحی عمل کی رائے سے اگرچہ اصلاح کے مفہوم کے ایک نسبتی گوشہ پر روشنی پڑی ہے، لیکن خود اصلاح کی انجام دہی کے ترکیبی ڈھانچہ اور چھاپ کو اس رائے میں نظر

۱- عبادی، احمد، ''مفہوم الترتیل فی القرآن الکریم، النظریۃ والمنہج''، رباط: دار ابی رقراق للطباعۃ والنشر، ط:۱، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۶۲- نیز دیکھئے: صفحات: ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۴۱، ۲۴۴۔ مزید وسیع معلومات کے لئے اس کتاب پر میرے تحقیقی مقالہ کا مطالعہ کیجئے- اس کا عنوان ہے: حسنی، اسماعیل، ''قراءۃ فی کتاب مفہوم الترتیل فی القرآن الکریم النظریۃ والمنہج''، مجلۃ الترتیل، شمارہ ۱، ۲۰۱۳ء، ص: ۲۰۹۔

انداز کر دیا گیا ہے۔

اس رائے سے کہ ''اصلاح'' انسانی مہارت کا نام ہے، اگر چہ اصلاح کو بہتر طریقہ پر عملی جامہ پہنانے اور منطبق کرنے کے سلسلہ میں انسان کی ذمہ داری واضح ہوتی ہے، لیکن اس تعریف میں اصلاح کے متعدد مظاہر اور اس کے تشکیلی اسباب کا کامل استحضار موجود نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان تعریفات کو بیان کرنے والوں کی اکثریت اس طرف متوجہ نہیں ہوئی ہے کہ قرآن مجید میں وارد اصلاح کے تشکیلی اسباب ہیں، نیز اس کے اعتقادی، فکری اور عملی مظاہر ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب کی نمایاں ترین خصوصیت ان ساری باتوں کی طرف بصیرت افروز توجہ ہو۔

علمی منہج کے اسباق سے ہم نے یہ بات سیکھی ہے کہ تنقیدی نظریہ کے اصول کو اپنائے بغیر کسی مفہوم کی تشکیل کی ہمارے لئے کوئی راہ نہیں ہے، خواہ اس کا موضوعی دائرہ و میدان اور علمی سطح کچھ بھی ہو(۱)۔

۱- اس نظریہ کی روشنی میں ''علم'' اس کے اصول کو عمل میں لانے اور اس کے آلات اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے کی منہجی قدرت کا نام ہے۔ جو ایک ایسی قدرت ہے جس کے ذریعہ ایک محقق و اسکالر اس کے موضوع سے مفاہیم کا ایک مرتب مجموعہ نکال سکتا ہے، تا کہ دوبارہ موضوع کو سمجھنے اور پیدا ہونے والے اشکالات کے حل کے سلسلہ میں اس کی افادیت کو مسلسل جانچ سکے۔ چنانچہ علمی نظریہ کا قالب اس کے اصول کو عمل میں لانے اور اس کے آلات (Tools) اور ٹیکنالوجی کے استعمال کی منہجی قدرت ہے؛ کیونکہ اسی قدرت کی روشنی میں ہم اپنے ان مفاہیم کو واضح کر سکتے ہیں، جن سے ایک طرف موضوع کی فطرت کے ساتھ ان کی ہم آہنگی کی حد کے اعتبار سے ان کی اختراعی قدر متعین ہوتی ہے، تو دوسری طرف ان میں شامل مختلف پہلوؤں: مسائل اور اشکالات کے سمجھنے کے سلسلہ میں ان کی حصہ داری کی حد معلوم ہوتی ہے۔ اس معنی میں مفاہیم و تصورات تقدس کے حامل نہیں ہیں، اس لئے کہ اگر ہمیں پتہ چل جائے کہ یہ مفہوم، یا کوئی دوسرا مفہوم علم و معرفت کی صورت حال سے ہم آہنگ اور موزوں نہیں ہے، تو ہمیشہ اور دائمی مطلوب یہ ہے کہ مسلسل تحقیق کی جائے، شاید ہم کسی دوسرے مفہوم کو وجود میں لاسکیں جو زیادہ مفید ہو، یہ مطلوب نہیں ہے کہ علم و معرفت کی صورت حال کو کسی مفہوم میں منحصر کر دیا جائے۔

اس پہلو کی وسیع واقفیت کے لئے ہمارے درج ذیل مقالہ کا مطالعہ کیا جائے: حسنی، اسماعیل، ''الفکر المقاصدی و ترسیخ الفکر العلمی''، مجلۃ اسلامیۃ المعرفہ، شمارہ: ۵۷ (۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء)، ص: ۶۸۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآنی مفاہیم کی تشکیل کے مرحلہ تک رسائی قرآن مجید کی علمی معرفت وواقفیت کی پختگی کی قوی دلیل اور بڑی علامت ہے؛ کیونکہ علمی عقل عمومی طریقہ پر مفاہیم وتصورات کے ذریعہ ہی علمی موضوع کے ساتھ تعامل کرتی ہے، اس لئے کہ وہ ایسے ذہنی قوالب وڈھانچے ہیں جو متنوع اور متعدد حقائق پر مشتمل ہیں۔ اس سے ان اہل علم کا درجہ ظاہر ہوتا ہے جو تسلیم کرتے ہیں کہ شمولیت ایسا وصف ہے جس سے قرآن کریم کے عالم کے علم کو متصف ہونا چاہئے۔

بہرحال ''اصلاح'' ایسا علمی مفہوم ہونے سے قبل جس کی تعمیر وتشکیل ایک محقق واسکالر اپنے ایجاد کردہ نظریات اور رسائی حاصل کردہ قوانین اور آراء کے سیاق میں کرتا ہے۔ وہ ایک قرآنی مفہوم ہے جسے مختلف مقامات پر لایا گیا ہے اور ایسے معانی ومفاہیم کے خزانے پر مشتمل ہے، جن کا احاطہ اللہ عزوجل ہی کرسکتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے اس بات کو ترجیح دی کہ ''اصلاح'' کا استعمال کریں، اس پر تدبر کریں اور اسے دو سیاق میں رکھنے کی خاطر پوری کاوش اور جدوجہد کریں:

پہلا سیاق: اس کے ان مظاہر کا ہے جن کو قرآن مجید پیش کرتا ہے۔

دوسرا سیاق: قرآن کریم کے اندر اس کی تشکیل کے پیش کردہ اسباب کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم علمی اور تنقیدی اعتبار سے قانع ومطمئن نہیں ہیں کہ کہا جائے کہ ''اصلاح'' کے مفہوم کی مکمل وضاحت ممکن نہیں ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ان تمام مقامات کا مطالعہ مفید نہ ہو، جن کے اندر قرآن کریم میں ''فساد'' اور ''صلاح'' کا مادہ وارد ہے(۱)۔

یہ بات محل نظر ہے؛ کیونکہ ایک اسکالر اگر قرآن مجید میں وارد ''صلاح اور فساد'' کے

۱- استاذ تیجانی کی یہ عبارت قابل غور ہے: ''یہ غیر ممکن ہوسکتا ہے، بلکہ بسا اوقات ناپسندیدہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم تمام قرآنی مقامات پر روشنی ڈالیں''۔

تیجانی، ''الإصلاح فی القرآن: استکشاف المفہوم وبناء النظریۃ''، مرجع سابق، مجلّہ اسلامیہ المعرفہ، شمارہ: ٦٦، ۲۰۱۱ء۔ اس مجلّہ کی ویب سائٹ سے ماخوذ۔

مادہ کی مکمل چھان بین کے سلسلہ میں اپنی پوری علمی کوشش صرف کردے، تو وہ اصلاح کے مفہوم کے اساسی عناصر کو اجاگر کرسکتا ہے، جن میں صرف اصلاح کے اسباب ہی شامل نہیں ہوں گے بلکہ اس کے مظاہر بھی داخل ہوں گے۔

اس طرح یہ کتاب مقدمہ اور خاتمہ کے ساتھ چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں ہم نے اصلاح کے تشکیلی اسباب سے بحث کی ہے، کتاب کی باقی فصلوں میں ہم نے اصلاح کے اعتقادی، فکری اور عملی مظاہر کا تعین کیا ہے۔

معزز عرش کے مالک بلند و برتر اللہ عز وجل سے التجاء ہے کہ وہ اس عمل کے ذریعہ مؤلف، قاری اور تمام انسانوں کے درمیان اس کی اشاعت کی کاوش کرنے والوں کو نفع پہنچائے۔ اللہ عز وجل ہی درستگی کی توفیق دینے والا ہے۔

پہلی فصل
''اصلاح'' کے تشکیلی اسباب

ہر ''مسبب'' کا چونکہ ایک سبب ہوتا ہے، اور ہر نتیجہ کا ایک مقدمہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ''صلاح'' یا ''فساد'' کا بھی ایک متعین سبب یا مخصوص مقدمہ ہے۔ ''صلاح'' یا ''فساد'' کے مظاہر پر روشنی ڈالنے سے پہلے ہم پر لازم ہے کہ اس کیفیت کو اجاگر کریں، جس کے ذریعہ قرآن مجید نے ''اصلاح'' کے قضیہ کو پیش کیا ہے، اور پیش کرتا ہے۔ اسے جاننے کا ذریعہ یہ ہے کہ ''صلاح و فساد'' میں سے ہر ایک تک پہنچانے والے اسباب کی بصیرت حاصل کریں۔ اس میدان میں کتاب اللہ کے استقراء سے ہم نے دو بنیادی سبب کا استخراج کیا ہے، جن کی لڑیوں میں صلاح و فساد کے سارے اسباب پروئے جاتے ہیں اور داخل ہوجاتے ہیں۔

پہلا سبب ''تدافع'' (ایک دوسرے کو دفع کرنا) ہے، جس سے جمود و تناقض کے مقابلہ میں صلاح وجود پذیر ہوتی ہے، جبکہ جمود و تناقض فساد کا سبب ہیں۔ دوسرا سبب اعتدال و توسط ہے جس سے ''فساد'' پیدا کرنے والے اسراف کے مقابلہ میں صلاح پیدا ہوتی ہے۔

فرمان باری تعالی سے اس کی واضح طور پر صراحت ہوتی ہے۔ ارشاد ہے: ''**ولا تطيعوا أمر المسرفين، الذين يفسدون في الأرض ولا يصلحون**'' (سورۂ شعراء:۱۵۱-۱۵۲) (اور ظالموں اور حد سے گزرنے والوں کی باتوں میں مت آؤ، جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، اور ان کا اصلاح سے کوئی تعلق نہیں)۔

مبحث اول

جمود کے مقابلہ میں تدافع

دال فاء اور عین (دف ع) کے مادہ کے لغوی استعمالات متعدد ہیں۔ ایک استعمال سے ''ازالہ'' کے معنی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ عرب بولتے ہیں: ''**دفع إليه و دفعه و دفع عنه الأذى أو الشر**'' (اس نے پوری قوت کے ساتھ اذیت ناک چیز یا شر و برائی کا ازالہ کیا)۔ اسی سے ہم ''دفع'' زائل کرنے کے معنی میں بھی بولتے ہیں۔ اسی سے عرب ''مدفع'' دھکیلنے والے آلہ کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں، اس لئے کہ دوسرے دھکیلنے والے آلہ کو اسی کے ذریعہ دھکا دیا جاتا ہے۔ وادی کے نشیبی حصہ کو جہاں سیلاب بہتا ہے اور پانی کی دھاریں منتشر ہوتی ہیں ''مدفع الوادی'' کہتے ہیں، نیز اسی سے ''مدفع'' اس اونٹ کو کہتے ہیں جو مالک کی نگاہ میں حقیر ہو، جب بھی بوجھ اٹھانے کے لئے قریب ہو، حقارت کی وجہ سے اسے لوٹا دیا جائے۔

''مدفع'' اس حقیر شخص کو کہتے ہیں جسے اگر وہ ضیافت طلب کرے مہمان نہ بنایا جائے، اور اگر بھیک مانگے تو بھیک نہ دی جائے، گویا کہ وہ ذلیل وفقیر انسان ہے، اس لئے کہ ہر ایک اسے خود سے دور کرتا ہے۔ اور یہ مجازی استعمال ہے۔ ''ضیف مدفع'' اس مہمان کو بولتے ہیں جسے قبیلہ وخاندان کے افراد ایک دوسرے پر ٹال دیں۔

''شاۃ'' یا ''ناقۃ دافع ودافعۃ ومدفاع'' اس بکری یا اونٹنی کو کہتے ہیں جو کثرت دودھ کی وجہ سے اپنے بچہ کے سر پر دودھ ڈال دے۔ اسی سے ''مدافعت'' دفاع کرنے، بچاؤ کرنے اور دفع کرنے کے معنی میں ہے۔ عرب بولتے ہیں: ''**دافع عنه و دفع**'' (اس نے اس کا دفاع و

بچاؤ کیا)۔تم استعمال کرو گے:"**دفع الله عنک المکروہ دفعا**"(اللہ عزوجل تجھ سے ناگوار چیز کودور کرے)، نیز"**دافع الله عنک السوء دفاعا**"(اللہ عزوجل تجھ سے برائی و ناگوار چیز کودفع کرے)۔"اندفاع" کے معنی ہیں: کسی چیز کوخواہ کچھ بھی ہوکرگزرنا۔حدیث شریف میں ہے:"**أنه دفع من عرفات**"(یعنی نبی کریم ﷺ عرفات سے روانہ ہوئے)۔ یعنی وہاں سے اپنی رفتار کا آغاز کیا اورخود کو ہٹایا، یا اپنی اونٹنی کو وہاں سے ہٹایا اوراسے چلنے پر آمادہ کیا۔

"**المتدافع**" ذلیل وحقیر شخص کو کہتے ہیں، اسی طرح "مدافعت" مزاحمت اور مقابلہ کو کہتے ہیں(۱)۔

لفظ" دفع" قرآن کریم میں:

قرآن کریم کے درج ذیل آیات میں ہم مادہ" دفع" کا استعمال پاتے ہیں:

۱-"**ولولادفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض**"(سورۂ بقرہ:۲۵۱) (اگراللہ تعالی لوگوں کوایک دوسرے سے نہ ٹکرائے (حق وباطل کا معرکہ نہ ہو) تو روئے زمین پر فساد پھیل جائے)۔

۲-"**إن الله يدافع عن الذين آمنوا إن الله لا يحب كل خوان كفور**" (سورۂ حج:۳۸)(اللہ ایمان والوں کا دفاع کرتا ہے، اللہ خیانت کرنے والے، اورمنکر، ناشکرے اورناقدرے انسان کو پسندنہیں فرماتا)۔

۳-"**ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرا**"(سورۂ حج:۴۰)(اگراللہ تعالی لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ٹکراتا تو کتنی خانقاہیں، اورکلیسا، اورعبادت گاہیں اور مسجدیں مسمار کردی جاتیں، جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا رہا، اورلیا جاتا ہے، اوراللہ ان کی ضرور مدد کرے گا

۱- مزید واقفیت وجانکاری کے لئے دیکھئے: ابن منظور، جمال الدین محمد بن مکرم بن علی، لسان العرب، بیروت، دارصادر، (د،ت)، ج۸،ص:۸۷-۹۰۔

جواللہ کے مشن کی مدد کریں گے)۔

۴-''ادفع بالتی ھی أحسن السیئة نحن أعلم بما یصفون''(سورۂ مومنون: ۹۶)(تم برائی کو بہتر طریقہ پر دور کرو، ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کیا بک رہے ہیں)۔

۵-''ولاتستوی الحسنة ولا السیئة ادفع بالتي ھي أحسن فإذا الذي بینک وبینه عداوة کأنه ولي حمیم''(سورۂ فصلت:۳۴)(نیکی اور برائی یکساں نہیں ہوسکتی ہے، تم برائی کو بہتر طریقہ پر دور کرو، اس طریقہ سے وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے وہ گہرے وجگری دوست کی طرح ہوجائے گا)۔

۶-''إن عذاب ربک لواقع ماله من دافع''(سورۂ طور:۷،۸)(کہ تمہارے مالک کی طرف سے سزا واقع ہوکر رہے گی۔کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا ہے)۔

۷-''سأل سائل بعذاب واقع للکافرین لیس له دافع''(سورۂ معارج: ۱-۲)(ایک پوچھنے والا اس عذاب کے بارے میں پوچھتا ہے جو کافروں پر ہوکر رہے گا، اسے کوئی ٹال نہ سکے گا)۔

۱-''تدافع''اور''توازن کی تلاش:

دال، فاء اور عین (د،ف،ع) کے مادہ کے قرآنی استعمالات کے استقراء و چھان بین سے اس امر کا ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ اس مادہ کو تین تفصیلی لفظی مقامات میں لایا گیا ہے:

الف-اول اس محل میں کہ نافرمان بندے اور کفار قیامت کے دن کے جس عذاب کے منتظر ہیں، اسے کوئی ٹال نہیں سکتا ہے، یا مستحقین سے اسے کوئی روک نہیں سکتا، جیسا کہ سورۂ طور اور سورۂ معارج میں ہے۔

بہرحال اہل ایمان سے اللہ تعالی دنیا اور آخرت میں عذاب کو دور کردے گا۔جیسا کہ فرمان باری تعالی میں ہے:''إن الله یدافع عن الذین آمنوا إن الله لا یحب کل خوان کفور''(سورۂ حج:۳۸)(اللہ ایمان والوں کا دفاع کرتا ہے، اللہ خیانت کرنے والے، اور منکر،

ناشکرے اور ناقدرے انسان کو پسند نہیں فرماتا)۔

ب- دوسرا مقام: فوجی مقابلہ اور مڈبھیڑ کا ہے، جس کے دائرہ میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالی کچھ لوگوں کا دوسرے لوگوں کے ذریعہ دفاع فرماتا ہے۔ اسی فوجی محاذ آرائی کے ذریعہ روئے زمین کی درستگی برابر جاری ہے، اور اسی کے ذریعہ تباہی اور تخریب کاری کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔

جیسا کہ فرمان باری تعالی سے یہ بالکل واضح ہے: "**ولولادفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض، ولكن الله ذو فضل على العالمين**" (سورۂ بقرہ:۲۵۱) (اگر اللہ تعالی لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ٹکرائے (حق و باطل کا معرکہ نہ ہو) تو روئے زمین پر فساد پھیل جائے، لیکن اللہ سب پر فضل فرماتا ہے)۔ اس سے بھی زیادہ اس ارشاد الٰہی سے وضاحت ہوتی ہے: "**ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرا ولينصرن الله من ينصره**" (سورۂ حج:۴۰) (اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ٹکراتا تو کتنی خانقاہیں، اور کلیسا، اور عبادت گاہیں اور مسجدیں مسمار کردی جاتیں، جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا رہا، اور لیا جاتا ہے، اور اللہ ان کی ضرور مدد کرے گا جو اللہ کے مشن کی مدد کریں گے)۔

ج- تیسرا مقام: پرامن مقابلہ کا مقام ہے، جس کے دائرہ میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ ضروری ہے کہ دشمن کو بہتر طریقہ پر دفع کیا جائے؛ کیونکہ اس بہتر طریقہ کو اختیار کرنے میں اس بات کی امید ہے کہ ہمارے ساتھ اس کا تعلق دشمنی سے محبت و ہمدردی میں بدل جائے۔ فرمان باری تعالی ہے: "**ولا تستوي الحسنة ولا السيئة ادفع بالتي هي أحسن فإذا الذي بينك وبينه عداوة كأنه ولي حميم**" (سورۂ فصلت:۳۴) (اور نیکی اور بدی تو برابر نہیں ہوتی، برائی کو اس طریقہ سے دور کرو جو سب سے اچھا ہو، جس کے نتیجہ میں تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت تھی وہ تمہارا گویا جگری دوست اور گرم جوش ساتھی بن جائے گا)۔

ان تینوں مقامات کے مدنظر یہ بالکل واضح ہے کہ قرآن کریم میں وارد ''تدافع'' سے مقصود یہ ہے کہ وہ انسانی دنیوی زندگی اور وجود کے اندر توازن کے آلات ووسائل میں سے ایک آلہ اور وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''تدافع'' کا ہمیشہ یہ مفہوم نہیں ہے کہ ''تصادم وباہم ٹکراؤ ہو''، جس میں مخالف کو مغلوب کر دیا جائے، اس کی آبادی تہ و بالا کر دی جائے، اور زمین میں اس کی زندگی ختم کر دی جائے۔ ''تدافع'' کا ایک مطلب ''باہمی منافست اور مسابقت'' بھی ہے، جس کا مقصد بقائے باہم ہے، جس میں مقابلہ آرائی کرنے والا مخالف کے ساتھ رہائش وسکونت اختیار کرتا ہے، خواہ مخالف ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

اس طرح قرآن کریم ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم اچھے طریقہ سے، جس کی نمایاں صورت معافی ودرگذر ہے، برائی کو دور کریں۔ جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**ادفع بالتي هي أحسن السيئة**'' (سورۂ مؤمنون:۹۶) (تم برائی کو بہتر طریقہ پر دور کرو)۔

اس توازنی مفہوم کے پیش نظر ''تدافع'' دو چیزوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اس تعارف کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو ان مقاصد میں سے ایک ہے جن کا شارع نے مختلف لوگوں کی تخلیق کے ذریعہ قصد کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے: ''**يأيها الناس إنا خلقناكم من ذكر وأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا**'' (سورۂ حجرات:۱) (اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تم کو قوموں اور قبیلوں میں تعارف کے لئے تقسیم کیا ہے)۔

دوسری چیز جس سے یہ معنی ہم آہنگ ہے، وہ قرآنی سنن وقوانین میں سے ایک سنت وقانون ہے، اور یہ اختلاف کا قانون ہے، ارشاد الٰہی ہے: ''**ولو شاء ربك لجعل الناس أمة واحدة، ولايزالون مختلفين، إلا من رحم ربك، ولذلك خلقهم**'' (سورۂ ہود:۱۱۸-۱۱۹) (تمہارا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا (ایک رشتہ وحدت میں سب کو منسلک کر دیتا، لیکن نظام آزمائش کچھ اور چاہتا ہے) اور لوگ سوائے ان کے جن پر تمہارا

رب رحم فرمائے، اختلافات میں مبتلا رہیں گے، اسی کے لئے اس نے ان کی تخلیق فرمائی ہے)۔

یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے سماج پسند اور سماجی جاندار (Social Animal) ہے۔ جیسا کہ سماجیات کے ماہرین کہتے ہیں۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کی اجتماعیت کے نتیجے میں خواہشات اور معنوی رغبتوں اور چاہتوں میں اختلاف ہو، اور مادی مصالح اور منافع میں تعارض، تصادم اور ٹکراؤ پیدا ہو؛ کیونکہ انسانی نفس کی فطرت میں ایثار و ترجیح اور خودغرضی اور انانیت و گھمنڈ اور تواضع جیسے باہم مقابل ومتضاد طبعی صفات ہیں، نیز اس جیسی باہم متضاد و متناقض دیگر طبعی صفات بھی پائی جاتی ہیں۔ جس طرح انسانی عقل کی فطرت میں ایسی قابلیت وصلاحیت موجود ہے کہ وہ علم و جہل، اور ذہانت و کند ذہنی جیسے باہم مقابل ادراکات و سمجھ بوجھ کی تعمیر کر سکے، نیز دیگر باہم متناقض ومتعارض سمجھ بوجھ کی عمارت کھڑی کر سکے۔ یہ سارے کے سارے امور باہم متعارض ہیں جن سے چاہتوں، رغبتوں اور مطلوب ومقصود کی تحصیل کے سلسلہ میں باہمی منافست اور مقابلہ آرائی پیدا ہوتی ہے، نیز آراء، افکار و نظریات اور مذاہب و مسالک کے اندر تصادم و ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح خواہشات اور مصالح کے اندر بھی باہمی کشمکش جنم لیتی ہے۔ اسی بنا پر ہم اللہ تعالی کے قول کے مطابق لوگوں کے اختلاف کو سمجھ سکتے ہیں: "**ولو شاء ربک لجعل الناس أمة واحدة ولایزالون مختلفین**" (سورۂ ہود:۱۱۸) (اگر تیرا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت کی لڑی میں پرو دیتا (لیکن) وہ برابر اختلاف میں مبتلا رہیں گے)، اسی اختلاف کے مظاہر اور حقائق میں سے یہ بات ہے کہ ساری مخلوقات جوڑے جوڑے ہونے کی صفت سے متصف ہے، فرمان باری تعالی ہے: "**ومن کل شيء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون**" (سورۂ ذرایات:۴۹) (ہر چیز کو ہم نے جوڑے جوڑے بنایا ہے، ممکن ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو)۔ زوجیت اور جوڑے جوڑے ہونے کی بسیط ترین دلیل یہ ہے کہ ہر جوڑا دوسرے جوڑے سے مغایر، الگ، مختلف اور جدا ہے۔

مثال کے طور پر: انسانی مخلوق کے درمیان محبت والفت، مودت وانسیت اور باہمی احترام کا رشتہ ہوسکتا ہے، جیسے مرد اور بیوی کی (عمومی) حالت ہوتی ہے، لیکن (کبھی) باہمی معاشرت کے نتیجہ میں ایک قسم کا باہمی تصادم اور ٹکراؤ بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کا سبب جذبات اور طبیعت ومزاج میں تغیر ہوتا ہے، نیز مختلف قسم کی سمجھ اور ادراک واخذ کی سطح کے مختلف ہونے کی وجہ سے بھی ٹکراؤ کی یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح رغبتوں، چاہتوں، مصالح اور منافع کے تصادم وتعارض سے بھی یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ یہ باہمی تصادم اور منافست ومسابقت کی فطرت انسانی افراد کے موجود ہونے کی حالت میں ہی منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ فطرت قوموں، معاشروں اور جماعتوں کے موجود ہونے کی حالت کو بھی شامل ہے۔ سارے گروپ مصالح کی بڑی مقدار کی تحصیل، اور مفاسد کی بڑی مقدار کے ازالہ کی خاطر اپنی طاقتوں کا استعمال کرتے ہیں۔

۲- ''تدافع'' کے مظاہر:

''متوازن تدافع'' اپنا وجود اس طاقت سے حاصل کرتا ہے، جو اللہ تعالی نے انسان کے اندر پیدا کی ہے، جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کو دفع کرتے ہیں۔

اگر اللہ تعالی نے دفع کرنے کی قوت کی تخلیق نہیں کی ہوتی، اور اگر اللہ سبحانہ وتعالی نے اس کے عوامل ومحرکات کو وجود نہ بخشا ہوتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔ یعنی زمین کی مختلف جنسوں، نوعوں اور صنفوں کی مخلوقات وموجودات میں جو توازن کا نظام موجود ہے وہ درہم برہم ہوجاتا۔

انسان کے اندر دفع کرنے کی متنوع قوت ہے۔ ایک قوت اپنی بقاء اور اپنی نسل کی بقا کے لئے دفع کرنے کی شہوانی قوت کی قسم سے ہے(۱)۔

۱- اس شہوانی قوت کو متعدد اصطلاحات سے موسوم کیا جاتا ہے، جاندار میں اسے ''توالد وتناسل''، نباتات اور پودوں میں ''بیج''، معادن اور کانوں میں ''رسنے'' اور ''کیمیائی عناصر'' میں ''پیدائش'' کی قوت سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ ساری طاقتیں مناسب وموزوں کو تلاش کرتی ہیں، اپنے متضاد کو دفع کرتی ہیں، یا بقا کو طلب کرتی ہیں اور خود سے ہلاکت کو دور کرتی ہیں۔ جیسے: بچہ کے اندر ماں کے پستان کو منہ میں لینے کی فطری رغبت ہوتی ہے۔ جانوروں کے بچوں میں

ایک دوسری قوت دفع کرنے کی غضب پر مبنی قوت کے قبیل سے ہے، تا کہ اپنے لئے نفع بخش چیز کی طلب میں کوتاہی کرنے والے کو لوٹایا جاسکے، اس میں باقی انواع کو بھی برقرار رکھنا پایا جاتا ہے؛ کیونکہ انسان ان کا دفاع کرتا ہے، اس لئے کہ ان کی بقا میں خود اس کے فوائد ومنافع ہیں۔

تیسری قسم کی طاقت وہ ہے جو دفع کرنے کی عاقلانہ ودانشمندانہ قوت کی قسم سے ہے، تا کہ مناسب دلائل وبراہین کے ذریعہ اپنی آراء، افکار ونظریات اور عقائد کا دفاع کیا جاسکے۔ اگر دفع کرنے کی شہوانی، غضب پر مبنی اور عاقلانہ ودانشمندانہ قوت نہیں ہوتی، جسے اللہ تعالی نے موجودات کے اندر پیدا کیا ہے، تو ایک دوسرے کے حق میں سرکشی کرتے اور زمین میں فساد پھیل جاتا۔ اس لئے ضروری تھا کہ کچھ لوگ دوسروں کو دفع کریں، چنانچہ مصلحین اپنے میں سے فساد وبگاڑ پیدا کرنے والوں کو دفع کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: "**ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض ولكن الله ذوفضل على العالمين**" (سورۂ بقرہ:۲۵۱) (اگر اللہ تعالی لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ فرماتا، تو ضرور زمین میں فساد پھیل جاتا، لیکن اللہ تعالی سارے جہاں والوں پر فضل فرماتا ہے)۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ آیت کریمہ فساد یا صلاح کی وضاحت کرنے والے بنیادی سبب پر مشتمل ہے۔ اگر لوگوں کے درمیان تصادم کی قوت نہ ہوتی تو زمین میں فساد پیدا ہوجاتا۔ امام ابن عاشورؒ کی خوبی اللہ عزوجل ہی کے لئے ہے، انہوں نے کیا پتے کی بات کہی ہے: ''اس آیت کا مضمون کائنات کی عبرتوں میں سے ایک عبرت، تاریخ کی حکمتوں میں سے ایک حکمت اور عمرانیات کا ایک نظام ہے، جس کی رہنمائی اس آیت کے نزول سے پہلے نہیں ہوئی''(۱)۔

چراگاہوں میں جانے کی چاہت ہوتی ہے۔ اسی طرح حملہ آور اور چہرہ کے درمیان ہاتھ لانے کا شعور ہوتا ہے، جیسے گائے بغیر کسی تامل کے حملہ آور کی قوت دفاع کرنے والے کی قوت سے بڑھ کر ہے، محض حملہ کا احساس ہوتے ہی اپنا سر سامنے لے آتی ہے۔

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۲، ص:۵۰۰۔

بنا بریں، اس متوازن مفہوم کے مدنظر ''تدافع'' کے دو تفصیلی مظہر ہیں: ایک پرامن مظہر ہے، دوسرا فوجی مظہر ہے۔

پہلا پرامن مظہر:

''تدافع'' کے پرامن مظہر کی متعدد شکلیں ہیں:

۱-ایک ''ذاتی تدافع'' کی شکل ہے، اس لئے کہ ہمیشہ ہم اپنی ذاتوں کے ذریعہ ہی ''تدافع'' سے گزرتے ہیں۔ اس طرح کہ ان مذموم باطنی خیالات اور جراثیمی امراض کو ہم دفع کرتے ہیں جو ہمارے جسم اور مختلف اعضاء پر حملہ آور ہوتے ہیں، اس لئے ہمیں دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے، ان میں پہلی بات یہ ہے کہ نفس کا مسلسل محاسبہ کریں، تاکہ وہ ''نفس لوامہ'' (ملامت کرنے والا نفس) بن جائے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''**ونفس وما سوها، فألهمها فجورها وتقوها، قد أفلح من ذكها وقد خاب من دسها**'' (سورۂ شمس: ۷-۱) (قسم ہے نفس انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے موزوں و متناسب بنایا، اور اس کے اندر بدی اور تقوی کا مادہ رکھا۔ کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے نفس کو پاکیزہ بنایا اور ناکام ہوگیا وہ شخص جس نے اسے آلودہ کیا)۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیاطین کے وسوسے کے شر سے اللہ تعالی کی پناہ حاصل کی جائے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**قل أعوذ برب الناس، ملك الناس، إله الناس، من شر الوسواس الخناس، الذي يوسوس في صدور الناس، من الجنة والناس**'' (سورۂ ناس: ۱-۶) (آپ کہئے میں لوگوں کے پروردگار، لوگوں کے مالک و بادشاہ، لوگوں کے معبود کی وسوسہ ڈالنے والے شیطان کے شر سے پناہ لیتا ہوں، جو چھپ چھپ کر حملہ کرتا ہے، لوگوں کے سینہ میں وسوسہ ڈالتا ہے، خواہ یہ شیطان جنوں سے ہو، یا انسانوں سے)۔

۲-دوسری شکل اس تدافع کی ہے جو سماجی تربیت و پرداخت کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے؛ کیونکہ ایک انسان کی شخصیت کی تشکیل اور قوم و سماج کی تعمیر میں اس کے بڑے اصلاحی

اثرت مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک فرد جس کی پوری زندگی توحید، تزکیہ اور آبادکاری کے اقدار سے بھرپور طریقہ پر متصف ہونے پر تربیت ہوئی ہو، وہ سماجی اعتبار سے، موروثی یا برآمد کردہ مغایر ومخالف اقدار کے ساتھ تصادم اور کشمکش کی حالت میں نشوونما حاصل کرتا ہے۔ وہ شخص جو قول وعمل، ظاہر و باطن اور شعائر وسرگرمیوں کی ہم آہنگی کے ساتھ نشوونما پاتا ہے، وہ اس شخص سے الگ ہے جو تناقض وتضاد میں پختہ ہو اور قول وعمل میں عدم یکسانیت کا عادی ہو۔ جیسا کہ فرمان باری تعالی میں اس کا بیان ہے: ''**وممن حولكم من الأعراب منافقون، ومن أهل المدينة مردوا على النفاق**'' (سورۂ توبہ:۱۰۱) (تمہارے اردگرد جو بدو ہیں ان میں کچھ لوگ منافق ہیں۔ اور اہل مدینہ میں سے بھی کچھ لوگ نفاق پر جمے ہوئے ہیں)۔

رازیؒ تحریر فرماتے ہیں: '' وہ نفاق میں ثابت قدم اور مسلسل رواں دواں ہیں..... نفاق کے پیشے میں وہ سرکش اور حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اس پیشہ نفاق میں ان کی حیثیت استاذ کی ہے(۱)۔

بڑا فرق ہے اس شخص کے درمیان جو اپنی سماجی زندگی میں ظلم وانحراف کے مفاہیم کا تابع بن کر نشوونما پاتا ہے، اور اس شخص کے درمیان جو عدل واستقامت کے مفاہیم سے سیرابی حاصل کر کے اس زندگی میں نشوونما حاصل کرتا ہے۔

ہمیں اس جگہ اس '' سماجی تدافع'' کا سامنا ہے جسے اہل عدل ان لوگوں کے ساتھ انجام دیتے ہیں جو ظلم کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور انحراف اور ضلالت وگمراہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا تدافع ہے، جس کے نتیجے میں بہت جلد اشخاص اور اشیاء وجود پذیر ہوتے ہیں، اور بہت جلد افکار ونظریات اور نئی صورت حال جنم لیتی ہے۔ ان دونوں کی حالت میں کوئی یکسانیت نہیں ہے جو اپنے سماجی دائرے میں عدل واستقامت کے معانی ومفاہیم کو

۱- رازی، فخر الدین ابوعبداللہ محمد بن عمر، '' التفسیر الکبیر''، '' مفاتیح الغیب''، تقدیم وتحقیق: ہانی الحاج وعماد زکی بارودی، قاہرہ، مکتبہ توفیقیہ، ۲۰۰۳ء، ج۱۶، ص:۱۴۹۔

غالب کرنے کی حالت میں نشو ونما پاتا ہو، اور جو ظلم و جور اور ضلالت و گمراہی کے مفاہیم کو غالب کرنے کی حالت میں نشو ونما حاصل کرتا ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ آخری شخص زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو غلام کے مفاہیم میں زندگی گزارتا ہے(۱) وہ اس گونگے بہرے کی طرح ہوتا ہے جو کچھ نہیں سنتا ہے، اور کسی رائے پر قادر نہیں ہوتا ہے، اور نہ ہی نفع کی تحصیل اور ضرر کے ازالہ پر قادر ہوتا ہے۔ اس قسم کے انسان بت کے مشابہ ہیں۔ وجہ مشابہت یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسروں کا محتاج ہے۔ بت اس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ پجاری اسے اٹھائے، اسے رکھے اور اس کی خدمت کرے، اس لئے کہ وہ بہرے گونگے انسان کی طرح ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں ہوتا ہے، اور اپنے سرپرستوں کا محتاج ہوتا ہے۔ جو بات اس سے کہی جاتی ہے وہ اسے نہیں سمجھتا ہے، اور اپنی چاہت کی تعبیر پر قادر نہیں ہوتا ہے۔ وہ نہ سمجھتا ہے، نہ اس کی بات سمجھی جاتی ہے۔

''تدافع'' نہ ہونا اس بات کا محرک بن جائے گا کہ غلامی کے معانی و مفاہیم پر پرورش و پرداخت ہو۔ اس طرح کی پرورش و پرداخت اپنے حقیقی مفہوم میں ظلم و ستم جیسے مفاسد اور مادی و معنوی کمائی کے ثمرات و نتائج میں تصرف کرنے پر قادر نہ ہونے جیسے مفاسد کا سبب بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اپنی طاقتوں اور کمائی کے ثمرات و فوائد پر قادر ہو، وہ اس شخص کے برابر نہیں جو اپنی طاقتوں اور کمائی کے ثمرات کے اندر تصرف کرنے سے عاجز ہو۔ جو سنتا ہو اور جو نہ سنتا ہو، وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح گویائی رکھنے والا اور گونگا دونوں یکساں نہیں ہو سکتے ہیں۔ نیز راست رو منحرف کے مشابہ نہیں ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی قسم کے فرق کی نشاندہی

۱- بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ارشاد الٰہی: ''ضرب الله مثلاً عبداً مملوكا لا يقدر على شيء'' (سورۂ نحل: ۷۵) (اللہ تعالی ایک مملوک غلام کی مثال بیان فرماتا ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں) ہر اس غلام میں عام ہے جس کی یہ صفت ہو، نیز ہر اس آزاد میں عام ہے، جس کی یہ صفت ہو۔ رازی تحریر فرماتے ہیں: ''یہی قول راجح ہے، اس لئے کہ اس آیت میں اللہ تعالی کی مراد سے یہی ہم آہنگ ہے''۔ رازی، التفسیر الکبیر، ''مفاتیح الغیب''، مرجع سابق، ج ۲۰، ص: ۶۹۔

کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:''ضرب الله مثلاً عبداً مملوکاً لا یقدر علی شيء ومن رزقناه منا رزقا حسنا فهو ینفق منه سرا وجهرا هل یستون، الحمد لله بل أکثرهم لا یعلمون،وضرب الله مثلا رجلین أحدهما أبکم لا یقدر علی شيء وهو کل علی مولاه أینما یوجهه لا یأت بخیرٍ هل یستوی هو ومن یأمر بالعدل وهو علی صراط مستقیم ''(سورۂ نحل:۷۵-۷۶)(اللہ تعالی ایک مملوک غلام کی مثال بیان فرماتا ہے، جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے، اور اس شخص کی مثال بیان فرماتا ہے، جسے ہم نے اپنی طرف سے عمدہ رزق عطا کیا ہے، وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ طور پر خرچ کرتا ہے۔ کیا وہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں۔تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔(نیز) اللہ تعالی ان دو شخصوں کی مثال بیان فرماتا ہے، جن میں سے ایک گونگا ہے، وہ کسی چیز پر قادر نہیں ہے، وہ اپنے سرپرست کا محتاج ہے، جہاں بھی وہ اسے بھیج دیتا ہے، وہ کوئی بھلائی لے کر نہیں آتا ہے۔ کیا یہ شخص اور وہ شخص برابر ہوسکتے ہیں، جو انصاف کا حکم دیتا ہے، اور وہ سیدھی راہ پر گامزن ہے)۔

جو فرد ایسی فضا میں پرورش پاتا ہے، جس میں سماجی دائرہ پاکیزگی، اہلیت، خود اعتمادی، قوانین کا احترام اور مساوات و برابری جیسے قرآنی اصلاحی اقدار کا مشتاق ہوتا ہے۔ ایسا فرد دھوکہ بازی کے ان اقدار کے ساتھ مسلسل تدافع اور تصادم میں جیتا ہے، جن کو دھوکہ باز باپ، یا دھوکہ باز ماں، یا فریبی استاذ، یا سماج کے دوسرے دغاباز سیاسی وانتظامی قائدین اور دیگر سماجی ذمہ دار اپناتے ہیں۔''تدافع'' اور ''تصادم'' کے اس دائرہ میں افراد اور سماج کی تربیت ہوتی ہے، اس لئے کہ معاشرہ میں اخلاقی وعظ ونصیحت کی اہمیت اور ضرورت کے باوجود ان کی تربیت صرف اسی سے نہیں ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وعظ ونصیحت کی اپنی اہمیت ہے، لیکن اس کا دائرہ محدود ہے جبکہ تمام افراد پیروی اور اقتدار کے اقدار پر تربیت نہ پائیں، اور قوانین کے انطباق کے اشتیاق کے اقدار پر نشوونما حاصل نہ کریں۔

۳- پرامن مظہر کی شکلوں میں سے ایک یہ ہے کہ دینی یا دنیوی مطلوب کو وجود میں لانے کے لئے علمی وعملی باہمی مسابقت اور مقابلہ آرائی پیدا کی جائے۔ فرمان باری تعالی ہے:''**وفي ذلک فلیتنافس المتنافسون**''(سورۂ مطففین:۲۶)(اس سلسلہ میں مقابلہ کرنے والوں کو مقابلہ کرنا چاہئے)۔ یہ صورت معاون اور فریق مقابل اور دوست ودشمن دونوں کے ساتھ مطلوب ہے، اور اسے وجود میں آنا چاہئے، اس لئے کہ اپنے مخالف کے ساتھ ہمارا ''تدافع''سب سے پہلے عمدہ پرامن وسائل سے ہونا چاہئے جو اسے برباد نہ کریں اور اس کی آبادی کو تباہ نہ کریں؛ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس پرامن شکل کو اپنانے سے ہمارا مخالف باہمی کشمکش اور باہمی نفرت وبیزاری کی فضا سے نکل کر باہمی صلح اور الفت ومحبت کی فضا میں آجائے۔

۴- پرامن تدافع کی ایک شکل سماج کے گروپوں اور عناصر کے درمیان جماعتی اختلافات اور انفرادی اختلافات ہیں، جن کا محرک ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان، نیز متعین سماجی دائرہ کے اندر ایک فرد اور افراد کے ایک مجموعہ کے درمیان شخصی حیثیتوں کا فرق ہے۔ ایک اختلاف وہ بھی ہے جو فرد اور اقتدار کے درمیان ہوتا ہے۔ اس صورت حال کا سامنا فرعون کے جادوگروں کو ہوا۔ قرآن کریم نے ان کے اللہ تعالی پر ایمان لانے اور موسی علی نبینا وعلیہ السلام کی تصدیق کے بارے میں ان کے مدافعانہ موقف کو اس طرح پیش کیا ہے:''**فألقی السحرة سجدا قالوا أمنا برب هارون و موسی، قال أمنتم له قبل أن أذن لکم، إنه لکبیرکم الذي علمکم السحر فلا قطعن أیدیکم وأرجلکم من خلاف ولأصلبنکم فی جذوع النخل ولتعلمن أینآ اشد عذابا وأبقی،قالوا لن نؤثرک علی ما جآء نا من البینات والذی فطرنا فاقض مآ انت قاض إنما تقضي هذه الحیاة الدنیا، إنآ أمنا بربنا لیغفرلنا خطایانا ومآ أکرهتنا علیه من السحر، والله خیر وابقی**''(سورۂ طہ:۷۰-۷۳)(جادوگر سجدہ میں گر پڑے، وہ بول اٹھے: ہم ہارون اور موسی کے رب پر ایمان لائے۔ فرعون نے کہا: میری اجازت سے پہلے تم اس پر ایمان لے آئے۔ یقیناً

وہ تمہارا گرو گھنٹال ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ میں مخالف سمت سے تمہارے پیر ہاتھ کاٹ دوں گا۔ اور کھجور کے تنے پر تمہیں سولی پر چڑھا دوں گا۔ تمہیں یقین ہو جائے گا کہ ہم میں سب سے سخت وسنگین اور پائیدار عذاب دینے والا کون ہے۔ وہ بول پڑے: ہم اپنے خالق و مالک اور جو واضح دلائل و براہین ہمارے پاس آ چکے ہیں ان پر تجھے ترجیح نہیں دیں گے۔ تجھے جو کرنا ہے کر لے، تو اسی دنیوی زندگی کے بارے میں فیصلے کر سکتا ہے۔ ہم اپنے رب پر ایمان لائے تا کہ وہ ہمارے گناہوں کو اور اس جادوگری کو معاف فرما دے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا۔ اور اللہ ہی بہتر اور پائدار ہستی ہے)۔

یہ اختلاف اس وقت بھی پیدا ہوا جب رسول کریم ﷺ کے چچا ابوطالب نے آپ ﷺ کے پاس آ کر یہ پیش کش رکھی کہ وہ مال، بادشاہت اور جاہ و منصب جیسے شوق انگیز امور کے بدلے اپنی دعوت اور رسالت سے دستبردار ہو جائیں۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے تاریخ میں گونجنے والے اپنے سنہرے الفاظ کے ذریعہ حق کا دفاع کیا، اور یہ شاندار موقف اختیار کیا اور ارشاد فرمایا: ''اے میرے چچا! اگر وہ میرے دائیں ہاتھ میں سورج رکھ دیں، اور بائیں ہاتھ میں چاند، اس شرط پر کہ میں اس معاملہ کو چھوڑ دوں، تو بھی میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا، یہاں تک کہ اللہ تعالی اس دین کو غالب کر دے، یا اسی راہ میں میری ہلاکت ہو جائے''۔

۵- پرامن تدافع کی ایک شکل ''لاعلمی تدافع'' ہے، جس کے ذریعہ حاملین علم، مفکرین اور اہل رائے حضرات باطل کا قلع قمع کرنے اور اہل باطل کے شبہات کے ازالہ کی خاطر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں مناظرہ، بحث ومباحثہ و نقاش اور اجتہاد کے ذریعہ عقلی سرگرمی اور علمی تگ ودو پیدا ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''**بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فإذا هو زاهق، ولكم الويل مما تصفون**'' (سورۂ انبیاء:۱۸) (بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں تو وہ اس کا بھیجا نکال کر رکھ دیتا ہے، تبھی وہ بے جان ہو جاتا ہے اور بے تکی باتیں بولنے کی وجہ سے تمہارے لئے تباہی ہے)۔

''علمی وفکری تدافع'' سے سماج کی زندگی میں قوت وطاقت اور بھرپور زندگی کی چھاپ پڑ جاتی ہے۔اس سے سماج اس جمود سے نجات پا جاتا ہے،جس میں لوگ اگلے آباء واجداد کے چھوڑے ہوئے طریقے پر ان کے کمزور ہونے اور موجودہ دور میں ان کے اندر معاملات کو حل کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کے باوجود جم جاتے ہیں۔

جن امور میں جمود ہوتا ہے ان میں سرفہرست مشرکانہ عقائد ہیں جو فساد و بگاڑ کے اسباب میں سے ایک بنیادی سبب ہے۔شرک جس طرح اعتقاد میں ہوتا ہے،اسی طرح کبھی قول میں بھی ہوتا ہے،اور کبھی عمل میں بھی ہوتا ہے۔اسی پس منظر میں امام رازیؒ فرماتے ہیں:'' جان لو! کہ جو بھی فساد و بگاڑ ہوتا ہے وہ شرک کی وجہ سے ہوتا ہے،لیکن شرک کبھی عمل میں ہوتا ہے،قول واعتقاد میں نہیں ہوتا ہے۔اسے فسق وعصیان ونافرمانبرداری سے موسوم کرتے ہیں،اس وجہ سے کہ معصیت ایسا عمل ہے جو اللہ سبحانہ وتعالی کے لئے نہیں ہوسکتا ہے، بلکہ وہ تو نفس کے لئے ہی ہوسکتا ہے،اس لئے فاسق اپنے عمل کے ذریعہ اللہ تعالی کے ساتھ شرک ٹھہرانے والا ہے''(۱)۔

اس طرح اسلامی نقطہ نظر سے'' ناسخ'' کو اخذ نہ کرنا اور'' منسوخ'' سے چمٹے رہنا،ایسی چیز پر عمل ہے جس میں انسانیت کے لئے صلاح ودرستگی باقی نہیں رہی،لہذا یہ زمین میں فساد و بگاڑ کا سبب ہے؛ کیونکہ یہ مریض کا علاج اس دوا سے کرنا ہے جو اس کے لئے ایک ایسی حالت میں تجویز کی گئی تھی جو اس کے مرض کے حالات سے بدل چکی ہے۔اب دین اسلام عمومی اور دائمی طور پر انسانیت کے سامنے ہے،وہ سارے انسانوں کے لئے موزوں ہے(۲)۔

فوجی مظہر:

دوسرا مظہر فوجی مظہر ہے،جس میں باہمی کشمکش کے بقدر تصادم وٹکراؤ ہے، نیز باہمی

۱- رازی،''التفسیر الکبیر''؛'' مفاتیح الغیب''،مرجع سابق،ج۲۵،ص:۱۱۔

۲- ابن عاشور،التحریر والتنویر،مرجع سابق،ج۱،ص۲۷۳۔

معرکہ آرائی اور قتل وقتال ہے، جس کا نتیجہ انسانی وجود کا خاتمہ ہے(۱)۔

اس مظہر کے ذریعہ ''تدافع'' فوجی تشدد کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جو باہمی کشمکش اور ایک دوسرے پر غالب آنے کے قصد میں بدل جاتا ہے، جس میں ایک فریق دوسرے فریق پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسا کہ جنگوں کا حال ہے، جن میں لوگ فوجی تصادم اختیار کرتے ہیں؛ کیونکہ ظالمانہ جنگ کے ذریعہ جنگجو دوسرے کے منافع غصب کر لینا چاہتا ہے۔ جبکہ عادلانہ جنگ کے ذریعہ حق پرست باطل پرست سے انتقام وبدلہ لیتا ہے۔ یقیناً ''تدافع'' اس صورت کے مدنظر دین، نفس، مال اور عزت وآبرو کے مصالح کے تحفظ کا بنیادی سبب ہے۔ فرمان باری تعالی ہے:''**الذين أخرجوا من ديارهم بغير حق إلا أن يقولوا ربنا الله ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرا ولينصرن الله من ينصره إن الله لقوي عزيز**''(سورۂ حج:۴۰)(ان کو اپنے علاقوں سے بغیر کسی حق کے نکالا گیا ہے، صرف اس جرم میں کہ وہ یہ کہتے ہیں:''اللہ ہمارا رب ہے''۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ٹکراتا تو کتنی خانقاہیں وپرستش گاہیں، اور کلیسا وعبادت گاہیں اور مسجدیں مسمار کر دی جاتیں، جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا رہا، اور لیا جاتا ہے، اور اللہ ان کی ضرور مدد کرے گا جو اللہ کے مشن کی مدد کریں گے، بے شک اللہ طاقت والا اور غالب ہے)۔

اس کی مثالوں میں سے ایک مثال: معرکہ بدر اور یہود ومشرکین کے خلاف غزوہ احزاب کے صلیبیوں کے خلاف یرموک، مجوسیوں کے خلاف جنگ قادسیہ، صلیبیوں کے مقابلہ

۱- قدیمی دور میں جب کہ نوح -علی نبینا وعلیہ السلام- کو اپنی قوم کے راہ راست پر نہ آنے اور درستگی اختیار نہ کرنے کا یقین ہو گیا تو انہوں نے ان کے حق میں بددعا کی:''**وقال نوح: رب لاتذر على الأرض من الكافرين ديارا، إنك إن تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا إلا فاجرا كفارا**'' (سورۂ نوح:۲۶-۲۷)(نوح نے بددعا کی اے میرے مالک! ان کافروں میں سے کسی کو زمین پر چلتا نہ چھوڑ، اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے، اور ان کی اولاد بھی فاجر وبدکار اور کافر ومنکر ہوگی۔

میں ''حطین'' اور تاتاریوں کے مقابلہ میں ''عین جالوت'' کا واقعہ ہے۔ تاتاریوں نے عراق وشام کو تہ وبالا کر دیا تھا، انہوں نے بغداد اور آس پاس کے علاقوں میں تقریباً دس لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا۔ چنانچہ اس جگہ فوجی تدافع وتصادم ہی صلاح ودرستگی کا ذریعہ ہے، جس میں وہ مدد نمایاں ہوتی ہے، جس پر قرآن کریم نے اپنے اس ارشاد میں زور دیا ہے:''**وكان حقا علينا نصر المؤمنين**''(سورۂ روم:۴۷)(اور ایمان والوں کو مدد فراہم کرنا ہم پر لازم تھا)۔

نیز فرمان باری تعالی پر زور دیا گیا ہے:''**ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين**''(سورۂ آل عمران:۱۳۹)(تم لوگ بزدل اور کمزور نہ پڑو، اور نہ رنج وغم کے شکار ہو، تم اگر مومن ہو تو تم ہی برتر ہو)۔

پر امن اور فوجی تدافع کی شکلوں کا خلاصہ یہ ہے کہ نوع انسانی اپنی مقاصد کو وجود میں لانے کی خاطر ایک دوسرے کو دفع کرتی ہے۔ اس معاملہ میں مومن اور غیر مومن برابر ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:''**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر**''(سورۂ توبہ:۷۱)(مومن مرد اور مومن خواتین ایک دوسرے کے حمایتی ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی وبرائی سے روکتے ہیں)۔

اہل باطل بھی باطل کی خاطر ایک دوسرے کے معاون ہیں اور باہم باطل کا دفاع کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:''**المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض يأمرون بالمنكر وينهون عن المعروف**''(سورۂ توبہ:۶۷)(منافق مرد اور منافق خواتین ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے ہیں، وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں)، نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**والذين كفروا بعضهم أولياء بعض**''(سورۂ انفال:۷۳)(کفار ایک دوسرے کے ہمدم اور دمساز ہیں)، ارشاد الٰہی ہے:''**إن الذين كفروا ينفقون أموالهم ليصدوا عن سبيل الله فسينفقونها ثم تكون عليهم حسرة ثم يغلبون**''(سورۂ انفال:۳۶)(یقیناً جن لوگوں نے کفر اختیار کیا، وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے

روکیں۔ وہ مال کوخرچ کریں گے پھر وہ ان کے حق میں باعث حسرت بنے گا، اس کے بعد وہ مغلوب بھی ہوں گے)، نیز فرمان باری تعالی ہے:''**ولایزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم إن استطاعوا**''(سورۂ بقرہ:۲۱۷)(وہ برابر تم سے جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ تمہیں اگر ان کے بس میں ہوتو تمہارے دین سے پھیر دیں)۔

خلاصہ کلام یہ کہ''تدافع''میں جس قدر باہمی منافست اور مقابلہ آرائی کا مفہوم ہے، اسی قدر باہمی کشمکش، قتال اور باہمی عیب گیری کا بھی مفہوم ہے۔اس میں جس قدر سرگرمی کا مفہوم ہے اسی قدر باہمی مزاحمت اور ٹکراؤ کا بھی مفہوم ہے۔

بنابریں،''تدافع''میں اس باہمی منافست کے معانی و مفاہیم بھی ہیں جن کی غالب صورت یہ ہے کہ مؤثر دلیل کے ذریعہ تردید کی جائے، نیز اس میں باہمی تصادم وٹکراؤ کے معانی و مفاہیم بھی ہیں جن کی غالب صورت یہ ہے کہ اس فوجی طاقت کے ذریعہ تردید کی جائے، جس کے ذریعہ ہم اپنے عقائد، اقدار اور مصالح کا تحفظ کرسکیں۔ چنانچہ راغب اصفہانی نے کیا موزوں وعمدہ بات کہی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:''دفع.....کو''عن''کے ذریعہ متعدی کیا جائے تو اس میں حمایت وتحفظ کا مفہوم شامل ہوتا ہے، جیسے:فرمان باری تعالی ہے:''**إن اللہ یدافع عن الذین آمنوا**''(سورۂ حج:۳۸)(یقیناً اللہ تعالی اہل ایمان کا دفاع وتحفظ فرماتا ہے)(۱)۔

بہرحال مناسب یہ ہے کہ''تدافع''کے مظاہر کی بنیاد حق پر رکھی جائے، ان متضاد خواہشات کی پیروی پر نہ رکھی جائے جو خواہشات پرستوں کو منفی انانیت اور ذاتی حرص وطمع کے بھنور میں ڈال دیتی ہے(۲)۔

اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے:''**ولواتبع الحق أھواء ھم لفسدت السموات**

۱- راغب اصفہانی،مفردات الفاظ القرآن،مرجع سابق،ص۳۱۶۔

۲- آخرت میں نجات اسی خواہش نفس کو چھوڑنے سے حاصل ہوگی۔فرمان باری تعالی ہے:''**وأما من خاف مقام ربہ، ونھی النفس عن الھوی فإن الجنۃ ھي المأوی**''(سورۂ نازعات:۴۰-۴۱)(اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا،اور نفس کو خواہشات سے روکتا رہا،تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

والأرض ومن فيهن"(سورۂ مؤمنون:۷۱)(اگرحق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا،تو آسمانوں اورزمین اوران میں جوبھی ہیں سب تباہ ہوجاتے)۔یعنی رب تبارک وتعالی وہی کرتا جو یہ مشرک لوگ چاہتے ہیں،اوران کی مشیئت وارادہ کے مطابق تدبیروانتظام فرماتا،اوراس حق کوچھوڑ دیتا جسے وہ ناپسند کررہے ہیں،تو آسمانوں اورزمین اوران میں جوبھی ہیں سب درہم وبرہم اورتباہ وبرباد ہوجاتے۔ایسااس وجہ سے ہوتا کہ ان کومعاملات کے انجام کی خبرنہیں ہے اورصحیح اورغلط تدبیر کی واقفیت نہیں ہے،اگرمعاملات وامور ان کی مشیئت اورخواہشات کے مطابق جاری رہتے توآسمان اورزمین اوران میں جوبھی مخلوقات ہیں وہ صحیح حالت میں نہیں رہتیں،اس لئے کہ ان ساری چیزوں کا قیام حق کی بناپر ہے(۱)۔

یہی وجہ ہے کہ حقائق کے ذریعہ خواہشات کودفع کرنا واجب ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:"**یا داؤد إنا جعلناک خلیفة في الأرض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الهوی فیضلک عن سبیل الله إن الذین یضلون عن سبیل الله لهم عذاب شدید بمانسوا یوم الحساب**"(سورۂ ص:۲۶)(اے داؤد!یقیناً ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ وحاکم بنایاہے،سوتم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو،اورخواہشات کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے گمراہ کردے، بے شک جولوگ اللہ کی راہ سے گمراہ ہوں گے ان کو حساب کادن بھولنے کی وجہ سے سخت عذاب ہوگا)۔

یقیناً خواہش نفس ایسا سبب ہے جومتعدد مفاسد کا ذریعہ ہے:کبھی یہ اعتقادی مفاسد ہوتے ہیں،جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:"**أفرأیت من اتخذ إلهه هواه**"(سورۂ جاثیہ:۲۳) (کیاآپ نے دیکھااس شخص کوجس نے اپنی خواہشات کومعبود بنارکھاہے)،نیزفرمان باری تعالی ہے:"**إن الساعة آتیة أکاد أخفیها لتجزی کل نفس بما تسعی، فلایصدنک عنها من لا یؤمن بها واتبع هواه فتردی**"(سورۂ طہ:۱۵-۱۶)(بے شک قیامت آنی

۱- طبری،جامع البیان عن تأویل آي القرآن،مرجع سابق،ج۱۷،ص:۷۷۔

ہے، جسے میں مخفی رکھتا ہوں۔ تا کہ ہر انسان کو اس کے عمل کا بدلہ ملے۔ لہذا جو اسے نہیں مانتا اور اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے، وہ تمہیں اس پر ایمان لانے سے نہ روک سکے، ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے)۔ بلکہ اگر آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالی کے سوا معبود ہوتے تو دونوں بگاڑ کا شکار ہو جاتے اور درہم برہم ہو جاتے۔ اس لئے کہ ہر معبود کی اپنی خواہش ہوتی جو دوسرے معبود کی خواہش سے الگ ہوتی، لہذا آسمان وزمین کے اندر تباہی وبربادی مچ جاتی۔ یہ امر فرمان باری تعالی میں بالکل واضح ہے، "**لو كان فيهما الهة إلا الله لفسدتافسبحان الله رب العرش عما يصفون**" (سورۂ انبیاء:۲۲) (اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا کئی معبود ہوتے تو دونوں تباہ ہو جاتے، سو اللہ جو عرش کا مالک ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بک رہے ہیں)۔

کبھی یہ سلوک و برتاؤ کے مفاسد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "**فادع واستقم كما أمرت ولا تتبع أهواء هم**" (سورۂ شوری:۱۵) (پس اسی کی آپ دعوت دیں اور جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اسی پر استقامت کا مظاہرہ کریں، اور ان کی خواہشات اور رجحانات کو نہ مانیں)۔

نیز اللہ رب العزت کا فرمان ہے: "**أفكلما جاء كم رسول بمالا تهوى أنفسكم استكبرتم ففريقا كذبتم وفريقا تقتلون**" (سورۂ بقرہ:۸۷) (پھر کیا یہ نہیں ہوا کہ جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری خواہشات کے خلاف پیغام لایا، تو تم نے تکبر کی روش اختیار کی، اور بہت سے رسولوں (اور مصلحوں) کو تم نے جھٹلایا، اور بہت سوں کو قتل کیا)۔

اسی طرح اللہ رب العزت کا فرمان ہے: "**فلا تتبعوا الهوى أن تعدلوا، وإن تلوا أو تعرضوا فإن الله كان بما تعملون خبيرا**" (سورۂ نساء:۱۳۵) (لہذا خواہشات اور جذبات کی پیروی میں عدل وانصاف کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا ہے، اور اگر تم موڑ توڑ کر یا حق سے کتراتے ہوئے اور بچتے ہوئے کوئی بات کرو گے، تو اللہ کو تمہاری باتوں اور عمل کی خوب خبر ہے (تم اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے))۔

۳-تدافع اوراس کے آلات(Tools) ووسائل:

یقیناً ہم سے مطالبہ ہے کہ ''تدافع'' کو استعمال کرنے کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری انجام دیں، خواہ ہم ''تدافع'' کو پر امن شکل میں استعمال کریں یا فوجی شکل میں استعمال کریں، بہرحال ہم صلح میں بھی ''تدافع'' کے آلات(Tools) ووسائل کو اختیار کریں۔جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:''**ادفع بالتي هي أحسن السيئة**''(سورۂ مؤمنون:۹۶)(تم برائی کو بہتر طریقہ پر دور کرو)۔

اسی طرح ہم ''تدافع'' کے آلات ووسائل کو اپنے اوپر ظلم ہونے کی صورت میں بھی اختیار کریں۔اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:''**أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وإن الله على نصرهم لقدير**''(سورۂ حج:۳۹)(جن سے جنگ کی جارہی ہے ان کو(جنگ کی) اجازت ہے؛ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے،اور اللہ ان کی نصرت پر قادر ہے)۔

نیز فرمان باری تعالی ہے:''**والذين كفروا يقاتلون في سبيل الطاغوت، فقاتلوا أولياء الشيطان إن كيد الشيطان كان ضعيفا**''(سورۂ نساء:۷۶)(اور جولوگ کافر ہیں وہ طاغوت کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں،(اے ایمان والو!)تم شیطان کے چیلوں سے جنگ کرو،یقین رکھو کہ شیطان کی چالیں کمزور ہیں)۔

اسی طرح اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدوالله وعدوكم وآخرين من دونهم لاتعلمونهم الله يعلمهم**''(سورۂ انفال:۶۰)(اوران سے مقابلہ کے لئے ہر ممکن طاقت تیار رکھو،گھوڑوں کو مورچہ پر رکھو،اس کے ذریعہ تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں،اوران کے علاوہ جو دوسرے(ان کے ساتھ ہیں) جن کو تم نہیں جانتے،اللہ جانتا ہے،ان سب کو اپنی طاقت سے مرعوب کردو،اس کا خوف ان کے دلوں میں بٹھادو)۔

نیز فرمان باری تعالی ہے:''**وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كله**

لله''(سورۂ انفال:۳۹)(اے مسلمانو!)اور ان سے جنگ جاری رکھو، جب تک کہ'' فتنہ''(حق کو کچلنے، دبانے اور اہل حق پر مظالم کا سلسلہ)ختم نہ ہوجائے، اور نظام اطاعت الٰہی پورے طور پر نافذ نہ ہوجائے)۔

فکری اعتبار سے'' تدافع'' کی عملی صورت گری کئی آلات کے اندر ہوتی ہے، ان میں عظیم ترین دو آلات ہیں:

پہلا آلہ جمود پر تنقید ہے، جبکہ دوسرا آلہ: تناقض پر تنقید ہے۔

الف-'' تدافع''اور'' جمود'' پر تنقید کا آلہ:

جمود کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ جوابدہی اور محاسبہ کی ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کی قدرت نہ ہو۔ فرمان باری تعالی ہے:''**وإذا قيل له اتق الله أخذته العزة بالإثم فحسبه جهنم ولبئس المهاد**''(سورۂ بقرہ:۲۰۶)(اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو گھمنڈ اسے گناہ پر اور جما دیتا ہے، اس کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے)(۱)۔

۱- اس آیت کے اندر تین احتمالات ہیں: پہلا احتمال یہ ہے کہ: اس میں خطاب نبی کریم ﷺ کی طرف متوجہ ہو، لہذا مقصود منافقین ہوں گے، اور اس وقت ان کی اکثریت یہود سے تھی، جبکہ ان میں مدینہ کے کچھ مشرکین بھی تھے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ: اس میں خطاب متعین شخص کی طرف متوجہ ہو، جیسے اقنس بن شریف ثقفی، جو کہ نبی کریم ﷺ سے محبت ومودت کا اظہار کرتا تھا، اور اسلام ظاہر کرتا تھا۔ لیکن جب معرکہ بدر اختتام کو پہنچا تو بہ قول بعض: اس نے مسلمانوں کی کھیتی جلادی، اور ان کے گدھے کو مار ڈالا، تو اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، جس طرح اس کے بارے میں دوسری آیتیں نازل ہوئیں، ان میں سے ایک آیت یہ ہے:''**ولاتطع كل حلاف مهين هماز مشاء بنميم**''(سورۂ قلم:۱۰-۱۱)(اور آپ ہر اس شخص کی بات نہ مانیے جو بہت قسمیں کھانے والا ہے، بے حیثیت ہے، طنز وطعنہ باز ہے اور چغلخور ہے)۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ: اس میں خطاب غیر متعین افراد سے ہو، تاکہ ہر مخاطب کو اس بات سے خبردار کیا جاسکے کہ اس پر نفاق اور منافقین کی چالیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اور رائج نہ ہوسکیں۔ دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۲، ص:۲۷۰۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ناقدانہ فکر ہے جو اس بات کی طرف مشیر ہے کہ اس قسم کے انسان محاسبہ، جوابدہی اور ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ اگر اس پر تنقید کی جاتی ہے تو بہت جلد غصہ سے بھر جاتا ہے اور اپنی منفی انانیت کا بدلہ لیتا ہے۔ اللہ عز وجل کا ارشاد ہے: ''**وإذا قيل له اتق الله أخذته العزة بالإثم فحسبه جهنم ولبئس المهاد**'' (سورۂ بقرہ:۲۰۶) (اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو، تو کبر و گھمنڈ اسے گناہ پر جما دیتا ہے، اس کے لئے جہنم کافی ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے)۔

سموأل شاعر کہتا ہے:

''**وننكر إن شئنا على الناس قولهم ولا ينكرون القول حين نقول**''

(اگر ہم چاہتے ہیں تو لوگوں کی باتوں پر نکیر کرتے ہیں، اور وہ ہماری باتوں پر نکیر نہیں کر سکتے ہیں)۔

چنانچہ یہ شخصیت حق کا اعتراف کرنے کی بجائے گھمنڈ و تکبر کی وجہ سے گناہ پر اور جم جاتا ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ اس کے بلند کردہ اصلاحی نعرے اور فساد و بگاڑ پر مبنی سرگرمیوں میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ اس گھمنڈ کی وجہ سے گناہ پر جمنے، اور بہت زیادہ خصومت اختیار کرنے اور فساد و بگاڑ کی بدی میں مبتلا ہونے کا سامنا کرتے ہوئے قرآنی سیاق ایسی شخصیت کو یوں جواب دیتا ہے: ''**فحسبه جهنم ولبئس المهاد**'' (سورۂ بقرہ:۲۰۶) (اس لئے جہنم کافی ہے، جو بہت برا ٹھکانا ہے)۔

اس قسم کے انسان ان لوگوں کے زمرہ سے کس قدر دور ہیں جن کی صفت اللہ تعالی نے یوں بیان فرمائی ہے: ''**الذين يستمعون القول فيتبعون أحسنه**'' (سورۂ زمر:۱۸) (جو باتوں کو غور سے سنتے ہیں اور بہترین باتوں کی پیروی کرتے ہیں)۔

اس جگہ غور سے سننے سے مراد سمجھنا اور مکمل طور پر احاطہ کرنا ہے؛ اس لئے کہ قرآن کریم کا ہر وہ محل جہاں اللہ تعالی نے مومنین کے لئے سماعت ثابت کی ہے، یا کفروں سے سننے کی نفی کی

ہے، اس کا مقصد بہ قول راغب اصفہانی ''معنی ومفہوم کا تصور اور اس کے بارے میں غور وفکر کرنا ہے''(۱)۔

بعض مفسرین نے ''غور سے سننے اور پیروی کرنے'' کے ضمن میں مضمر اصلاحی مقصود کو سمجھ لیا ہے(۲)، لیکن قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ان کی اکثریت نے اس اصلاحی مقصود کو ایک ناقدانہ عمل میں محصور کر دیا ہے جس پر لفظ تنقید کا لغوی معنی دلالت کرتا ہے۔ یعنی مختلف امور اور اشیاء کے درمیان امتیاز کرنے کی قدرت میں منحصر کر دیا ہے۔ جیسے: کھوٹے اور صحیح دراہم میں شناخت کی جاتی ہے، اور گندی اور پاکیزہ چیز میں امتیاز کیا جاتا ہے، حق و باطل، خیر وشر، بہتر اور بہترین، عمدہ اور عمدہ ترین، فاضل وافضل اور راجح ومرجوح کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے(۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل ایمان کی غور سے سننے اور پیروی کرنے کی قدرت وصلاحیت فہم کی سلامتی اور دقت استنباط کے ساتھ عقلی طور پر امتیاز کرنے کے وظیفہ میں ہی جلوہ گر نہیں ہے، بلکہ مختلف وظائف وفرائض اور اعمال کو شامل ہے۔ اس کی دلیل آیت کے اندر وارد اسم تفصیل کا صیغہ ہے، اسم تفضیل کے صیغہ سے مقصود فضل وخوبی میں اس سے متصف فرد کا تفاوت نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالی میں بھی یہی مفہوم ہے: ''**قال رب السجن أحب إلي مما يدعونني إليه**''(سورۂ یوسف: ۳۳)(یوسف نے کہا: اے رب! قید خانہ میرے نزدیک اس کام

۱- راغب اصفہانی، مفردات ألفاظ القرآن، مرجع سابق، ص: ۴۲۶۔

۲- آلوسیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''اللہ تعالی نے ان لوگوں کی اس طرح مدح کی ہے کہ وہ دین کے سلسلہ میں ناقدانہ نگاہ ڈالنے والے ہیں''۔ ابن عاشورؒ رقم طراز ہیں: ''اللہ تعالی نے ان کی تعریف کی ہے کہ وہ تنقیدی صلاحیت کے حامل ہیں، وہ ہدایت اور ضلالت کے درمیان خط امتیاز کھینچتے ہیں، اور حکمت وتوہمات کے درمیان فرق کرتے ہیں، وہ حقیقی دلائل پر نظر ڈالتے ہیں، اور سوفسطائی وتوہماتی دلائل پر تنقید کرتے ہیں۔ دیکھئے: آلوسی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، مرجع سابق ج ۲۳، ص: ۲۵۲، ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۲۳، ص ۳۶۶۔

۳- ابن منظور، لسان العرب، بیروت: دار الکتب العلمیہ، ط: ۱، ۱۹۹۲ء، مادہ: نقد، نیز دیکھئے: آلوسی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، مرجع سابق، ج ۲۳، ص: ۲۵۲-۲۵۳، رازی، ''التفسیر الکبیر''، ''مفاتیح الغیب''، مرجع سابق، ج ۲۶، ص: ۲۳۸۔

سے پسندیدہ ہے، جس کی یہ لوگ مجھے دعوت دے رہے ہیں)۔اسم تفضیل ''أحسنہ'' کا مقصود: صفت حسن کی قوت واستحکام ہے۔اور ''صفت حسن'' کی قوت کی عملی صورت گری ایک تنقیدی عمل میں نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ متعدد تنقیدی وظائف واعمال کو شامل ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ ''تنقید'' کبھی وسیع فکر پر دلالت کرتی ہے۔اہل ایمان وسیع فکر اور کھلے ذہن کے ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ساری باتیں غور سے سنتے ہیں۔اسی طرح ''تنقید'' کبھی بہترین اور عمدہ فکر پر دلالت کرتی ہے۔بہترین فکر وہ ہے جس کا حامل تنقید کا قصد کرے، اعتراض کا خواہاں ہو اور جوابدہی پر نظر رکھے، وہ کسی بات کو اس کی علمی، یا منہجی، یا تاریخی، یا فنی قدر (Value) کی چھان بین، تفتیش اور تنقیح کئے بغیر تسلیم نہ کرے..... یہ سب کے سب تنقیدی وظائف واعمال ہیں، اہل ایمان ساری باتوں کو غور سے سنے بغیر تنقیدی وظائف کو انجام نہیں دے سکتے ہیں، نیز اہل ایمان بہترین وعمدہ ترین باتوں کا انتخاب اور افضل ترین باتوں کی پیروی کے بغیر تنقیدی اعمال کی انجام دہی نہیں کرسکتے ہیں، فرمان باری تعالی ہے:''**الذين يستمعون القول فيتبعون أحسنه**''(سورۂ زمر:۱۸)(جو باتوں کو غور سے سنتے ہیں، پھر بہترین بات کی پیروی کرتے ہیں)۔یہ کلام بہ ظاہر کھلے پن اور وسعت نظر کی قدر (Value) پر مشتمل ہے، اس لئے کہ اہل ایمان ساری باتوں کو غور سے سننے پر قادر ہیں، بعض اہل علم نے کہا ہے کہ:''مومنین قرآن اور غیر قرآن کو غور سے سنتے ہیں، پھر قرآن کی پیروی کرتے ہیں''، بعض دیگر اہل علم کہتے ہیں:''اہل ایمان گزشتہ لوگوں کی بات سنتے ہیں''(۱) جبکہ کچھ اہل علم یہ کہتے ہیں کہ''یہ فرمان تمام باتوں میں

۱- ابن عطیہ اندلسی، ابومحمد، عبدالحق بن غالب، ''المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، تحقیق: المجلس العلمی جو کہ ''تارودانت'' میں واقع ہے، رباط: وزارۃ الاوقاف، (د،ت)، ج ۱۴،ص: ۷۳، نیز دیکھئے: خازن، علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم، ''تفسیر الخازن''؛''لباب التأویل في معاني التنزیل''، تحقیق: عبدالسلام شاہین، بیروت، دارالکتب العلمیہ (۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء)، ج ۴،ص: ۵۴، رازی، التفسیر الکبیر: ''مفاتیح الغیب''، مرجع سابق، ج ۲۶،ص: ۳۳۹- الوسی، ''روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی''، مرجع سابق، ج ۲۳،ص: ۲۵۳۔

عام ہے''(۱)،اسی طرح اہل ایمان اس آیت کے مطابق ایسے لوگ ہیں جو ہر بات کوغور سے سننے کی قدرت رکھتے ہیں،خواہ یہ بات کتاب وسنت صحیحہ کی وحی ہو، یا یہ بات کتاب وسنت سے باہر لوگوں کے اپنائے ہوئے مذاہب ومسالک اور اخذ کردہ اجتہادات اور آراء سے ماخوذ ہو۔اس بڑی صلاحیت کے نتیجہ میں اہل ایمان ساری باتوں کو سنتے ہیں،خواہ وہ حق، خیر اور مصلحت کی دعوت دیتی ہوں، یا باطل اور شر وفساد کی دعوت دیتی ہوں۔ان کے یہاں بند ذہن کی گنجائش نہیں ہے۔ان سے اس بات کا مطالبہ ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ باشعور کھلے اور وسیع ذہن کا واقعی نمونہ پیش کریں۔ اس آیت کے اندر اس کی دلیل ارشاد الٰہی:''القول'' ہے کہ اس میں''الف لام''، جنس کے لئے ہے،یعنی ہر قول کوغور سے سنتے ہیں،خواہ اس کا منبع ومرجع،اور دائرہ اور سطح کچھ بھی ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ:اہل ایمان اللہ تعالی کے احکامات کو سنتے ہیں اور بہترین احکام کی پیروی کرتے ہیں، اس لئے کہ قرآن میں بہترین اور بہتر اور ''احسن''اور''حسن'' دونوں ہیں۔احسن وافضل کو اختیار کرنے کی ترغیب کے ساتھ''حسن''وعمدہ کو اپنانے کی بھی اجازت ہے(۲)۔

چنانچہ اہل ایمان بہترین اقوال کی پیروی کرتے ہیں۔اس جگہ پیروی کرنے کا مطلب اختیار کرنا ہے، اس لئے کہ یہ اختیار کرنا دلیل وبرہان کے ساتھ دائر ہے؛ کیونکہ یہ دوسروں کے مذاہب، آراء اور افکار کے ساتھ باشعور طور پر چلنا ہے اور دلائل اور اصولوں کی بنیاد پر موافقت کرنا ہے، اگر اتباع وپیروی دلیل وبرہان سے خالی ہو تو یہ اختیار کرنا نہیں ہے، بلکہ تقلید پر جمود

۱- ابوحیان اندلسی،تفسیر البحر المحیط،مرجع سابق،ج۷،ص:۴۲۱۔

۲- بہ طور مثال اسی قسم سے فرمان باری تعالی ہے:''وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم به، ولئن صبرتم لهو خير للصابرين''(سورۂ نحل:۱۲۶)(اور اگر تم بدلہ لو تو اسی کے بقدر بدلہ لو جو تمہارے ساتھ کیا گیا ہے،اور اگر تم صبر کرو،تو یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے)،چنانچہ انتقام اور بدلہ لینا عمدہ وبہتر ہے،لیکن معاف کر دینا اور صبر کر لینا اس سے بھی زیادہ بہترین اور عمدہ ترین عمل ہے۔

کواپنانا ہے۔ جبکہ تقلید پر جمود میں کوئی بھلائی شامل نہیں ہے۔ ہماری عربی زبان کی نرالی اور عمدہ بات یہ ہے کہ لفظ ''اختیار'' قدر (Value) پر مشتمل ہے؛ کیونکہ وہ خیر وبہتری، تخیر وانتخاب سے مشتق وماخوذ ہے۔ ''اختیار''، ''احسن'' وبہترین شے کی سعی کو کہتے ہیں، یعنی ''اختیار'' یہ ہے کہ بہتر میں سے بہترین کی کاوش کی جائے اور اسے بہتر پر ترجیح دی جائے، اس لئے کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''**الذين يستمعون القول فيتبعون أحسنه**'' (سورۂ زمر:۱۸) (جو باتوں کو غور سے سنتے ہیں اور بہترین بات کی پیروی کرتے ہیں)۔ معاشرہ کی زندگی میں ''تنقیدی تدافع'' کو ایک زندہ ذریعہ کے طور پر برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ فرمان باری تعالی ہے: ''**فلولا كان من القرون من قبلكم أولوا بقية ينهون عن الفساد في الأرض إلا قليلا ممن أنجينا منهم**'' (سورۂ ہود:۱۱۶) (تم سے پہلے گزشتہ نسلوں اور لوگوں میں باشعور افراد کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد وبگاڑ سے روکتے، ہاں برائے نام چند افراد تھے جن کو ان میں سے ہم نے نجات دی)۔

''تنقیدی تدافع'' کا مطلب برائی وبدی پر نکیر، جوابدہی اور محاسبہ ہے، لہذا یہ فساد وبگاڑ کی شکلوں اور قسموں کا سامنا کرنے کے لئے ضروری ہے، چنانچہ اللہ تعالی بستی والوں کو ان کے ظلم وفساد کی وجہ سے اس وقت گرفت میں نہیں لیتا ہے، جبکہ وہاں کے باشندگان ارباب ظلم وستم اور فساد سے مقابلہ کی ذمہ داری اٹھا رہے ہوں، اور ظالموں اور مفسدوں پر تنقید کر رہے ہوں۔

استاذ سید قطبؒ رقم طراز ہیں: ''جس قوم میں فساد رونما ہو، اس طرح کہ غیر اللہ کے لئے کسی شکل میں لوگوں کو غلام بنایا جا رہا ہو، لیکن وہاں کچھ ایسے افراد ہوں جو اس فساد کے ازالہ کے لئے کمر بستہ ہو جائیں، ایسی قوم نجات پانے والی قوم ہے، اللہ عزوجل اسے عذاب نہیں دے گا، اور اسے تباہ نہیں کرے گا۔ بہرحال وہ قومیں جہاں ظالم لوگ ظلم کرتے ہوں، اور چند افراد بھی ظلم وفساد کے ازالہ کے لئے کمر بستہ نہ ہوتے ہوں۔ یا وہاں کچھ افراد ایسے ہوں جو نکیر تو کرتے ہوں، لیکن فساد زدہ صورت حال پر ان کی نکیر کا کوئی اثر نہ ہو، تو ایسی قوموں پر اللہ تعالی کا

قانون ثابت ہوجاتا ہے، یاتوان کا بالکل قلع قمع کردیا جاتا ہے، یاتو اخلاقی گراوٹ اور خلل کو دور کردیا جاتا ہے، پس صرف اللہ عزوجل کی ربوبیت، اور غیر اللہ کے سامنے جھکنے اور ذلت اختیار کرنے کی وجہ سے روئے زمین کو لاحق ہونے والے فساد سے اسے پاک کرنیکی دعوت دینے والے افراد کو قوموں اور انسانی گروہوں کے لئے باعث امن وامان ہیں۔ اس سے صرف اللہ سبحانہ وتعالی کی ربوبیت کا اقرار کئے جانے کے لئے جدوجہد کرنے والے افراد کی سعی وکاوش کی قدر و قیمت (Value) ظاہر ہوتی ہے، جو ظلم وفساد کی تمام صورتوں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں''(۱)۔

ب-''تدافع''اور''تناقض''پر تنقید کا آلہ:

''تنقیدی تدافع'' سے ہم اس بات کا پتہ لگانے پر قادر ہوتے ہیں کہ''اصلاح'' کی افادیت اور مشروعیت سب سے پہلے اصلاح کی دعوت دینے والے کی شخصیت کی نوعیت اور اصلاح کا دعوی کرنے والے کے التزام کی مقدار سے ماخوذ ہوتی ہے۔ اس فکر کی روشنی میں محض کسی امتیاز، انفرادیت اور استقلال کو وجود میں لانا مقصود نہیں ہے، اس لئے کہ انفرادیت کا قصد کوئی چیز نہیں ہے جبکہ وہ اس عمل سے مربوط نہ ہو، جو دعوت کی ماہیت وحقیقت پر روشنی ڈالے اور کسی درجہ میں دعوی کی حقیقت کی عکاسی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی کے نبی شعیبؑ نے اس بات پر متنبہ کیا کہ ان کی دعوت اور دعوی کا مقصد ان چیزوں میں مبتلا ہونے کا قصد نہیں جن سے وہ انہیں روک رہے ہیں۔ فرمان باری تعالی ہے:''**وما أريد أن أخالفكم إلى ما أنهاكم عنه إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت**'' (سورۂ ہود:۸۸)(میں یہ نہیں چاہتا کہ جن چیزوں سے تمہیں روک رہا ہوں؛ تمہارے پیچھے میں ان میں مبتلا ہوجاؤں، میں تو اپنے بس بھر اصلاح کی کوشش میں لگا ہوں)۔

۱- قطب، سید، فی ظلال القرآن، قاہرہ: دارالشروق، ط:۳۰، (۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء)، مجلد ۴، ج ۱۲، ص: ۱۹۳۳۔

سرکش اور متکبر افراد اس بات کی رعایت نہیں کرتے ہیں کہ ان کے قول وعمل میں ہم آہنگی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے تضاد کے جال میں پھنس جاتے ہیں، وہ لوگوں کو نیکی و بھلائی کا حکم دیتے ہیں، لیکن ان کی حقیقی صورت حال اور سرگرمیاں بدی و بدکاری کی ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے: ''**أتأمرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم وأنتم تتلون الكتاب أفلا تعقلون**'' (سورۂ بقرہ: ۴۴) (تم لوگوں کو بھلائی اور نیکی کی نصیحت کرتے پھرتے ہو، اور اپنے کو فراموش کر دیتے ہو، حالانکہ تم (آسمانی) کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو، کیا عقل وادراک سے کام نہیں لیتے؟)۔

اس لئے متعینہ طور پر یہ مطلوب نہیں ہے کہ قول وعمل میں مکمل مطابقت ہو، بس صرف یہ مطلوب ہے کہ اصلاح کی دعوت دینے والے اور اصلاح کا دعوی کرنے والے کے قول وعمل کے درمیان ہم آہنگی کو وجود میں لانے کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہو۔ اس لئے کہ ارشاد الٰہی ہے: ''**إن أريد إلا الإصلاح ماستطعت**'' (سورۂ ہود: ۸۸) (میں تو اپنے بس بھر اصلاح کی کوشش میں لگا ہوں)۔

دعوت کی صورت حال اور اس کی عملی حقیقت کے درمیان ہم آہنگی کے سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ اصلاح کا پختہ ومستحکم ارادہ ہو۔ مثال کے طور پر: عمومی طور پر اختلافات کے دائرہ کو کم کرنے اور بالخصوص میاں بیوی کے درمیان اختلافات کے ازالہ کی حکمین کی جدوجہد اور کاروائیاں خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن ان کاروائیوں کی افادیت اور ان کوششوں کی تاثیر اس بات سے مربوط ہے کہ حکمین اور میاں بیوی اصلاح کا پختہ ارادہ رکھتے ہوں۔ یہی وہ قرآنی سبق ہے جو فرمانی باری تعالی سے ماخوذ ہے: ''**وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكمامن أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما**'' (سورۂ نساء: ۳۵)(۱) (اور اگر میاں

۱- اس آیت سے حقوق کے اندر تحکیم یعنی ثالث منانے کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے، انہیں میں سے میاں بیوی کے حقوق ہیں۔

بیوی کے درمیان تعلقات ٹوٹنے کا اندیشہ ہو، تو مرد کے گھر والوں میں سے کسی کو حکم وثالث مقرر کرو، اور عورت کے گھر والوں میں سے کسی کو حکم وثالث مقرر کردو (ایک ایک ہوں یا زیادہ) اگر میاں بیوی صلح صفائی چاہیں گے (اور وہ دونوں حکم بھی تعلقات درست کرنا چاہیں گے) تو اللہ تعالی دونوں میں جوڑ پیدا کرے گا)۔

یقیناً درست بات بولنا اصلاح عمل کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: "**يأيها الذين آمنوا اتقوا الله وقولوا قولا سديدا يصلح لكم أعمالكم ويغفرلكم ذنوبكم**" (سورۂ احزاب: ۷۰-۷۱) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور درست بات کہو، وہ تمہارے اعمال درست فرمادے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا)۔

درست بات ایک علمی بات ہے، اس میں صرف قرآن اور رسول اکرم ﷺ سے صادر سنت وسیرت ہی شامل نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر وہ قول بھی شامل ہے جو انسانی معرفت کے دائرہ کے لحاظ سے علمی معرفت وواقفیت کی صورت حال کی رعایت کرے۔ درست بات یا علمی بات صرف ایک فرد کے عمل کو درست نہیں کرتی ہے، بلکہ وہ سماج اور قوم کے عمل کو بھی درست کرتی ہے۔ ''جمع مخاطب'' کی دونوں ضمیریں اہل ایمان کی طرف لوٹتی ہیں، لہذا ان میں تمام ادوار کے اہل ایمان شامل ہیں۔ بنابریں، ہم رسول کریم محمد ﷺ کی تنبیہ کے مقصد کو سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنے اقوال کے سلسلہ میں احتیاط اور تیقن کو اختیار کریں۔ جیسے: رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "**رحم الله من قال خيراً، أوصمت**"(۱) (اللہ تعالی اس شخص پر رحم فرمائے جو بھلی بات کہے، یا خاموش رہے)۔

ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی اپنی ان باتوں کے اعتبار سے نیک وصالح نظر آئے، جو ہمیں بھلی لگتی ہوں، نیز ان دلائل کے اعتبار سے صالح نظر آئے جن کی تشکیل اور اظہار میں اسے

۱- سخاوی، شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن "المقاصد الحسنة في بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسنة"، تحقیق: محمد عثمان خشت، بیروت، دار الکتاب العربی، ط: ۱، (۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)، حدیث نمبر: ۵۱۵۔

مہارت حاصل ہو، لیکن وہ شخص اپنی سرگرمیوں کے اعتبار سے فاسد وبگڑا ہوا انسان ہو۔ فرمان باری تعالی ہے: ''**ومن الناس من يعجبک قوله في الحيوٰة الدنيا ويشهد الله على ما في قلبه وهو الدالخصام وإذا تولى سعى في الأرض ليفسد فيها ويهلک الحرث والنسل والله لايحب الفساد**'' (سورۂ بقرہ: ۲۰۴-۲۰۵) (بعض لوگ ایسے ہیں کہ دنیاوی زندگی میں ان کی باتیں تم کو بڑی اچھی لگیں گی، اور وہ اپنے دل پر اللہ کو گواہ بنا کر پیش کریں گے، حالانکہ وہ بدترین اور سخت ترین دشمن ہوتے ہیں۔ وہ جب سامنے سے ہٹتے ہیں، تو علاقہ میں ان کی تگ ودو فساد وبگاڑ کے لئے، اور کھیتوں اور جانوروں کو تباہ وبرباد کرنے کے لئے ہوتی ہے، اور اللہ بگاڑ کو پسند نہیں کرتا)۔

لوگوں میں سے ایک فریق(۱) اپنے اقوال اور غلط سرگرمیوں کے درمیان تضاد کے ساتھ مخصوص ہیں ہمیں ان کی باتیں بھلی لگتی ہیں؛ کیونکہ ان کی شکل اور ساخت سے ایمان اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ بیان وتعبیر کی ایسی شکل ہے، جس میں خیر وبھلائی، محبت و الفت، ہمدردی، بے لوثی اور اخلاص کے ساتھ الفاظ کی جادوگری، جاذبیت اور کشش بھی ہے۔ لیکن وہ شخص جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**ألدالخصام**'' (بڑا سخت جھگڑالو اور سخت ترین دشمن ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ اس شخص کی تصویر الفاظ و بیان میں مربوط، شکل وصورت کے عناصر میں ہم آہنگ، عقلی دلائل میں موزوں ومناسب اور لفظی ساخت میں متناسب نظر آتی ہے۔ لیکن اگر اس کی یہ قولی یا لفظی تصویر یا شکل وصورت ہمیں بھلی معلوم ہو، تو اس کی حقیقی صورت حال مکروہ وناپسندیدہ ہے، اس سے انسانی آبادی کے سلسلہ میں اس کا فساد وبگاڑ جھلکتا ہے؛ کیونکہ اس کی حقیقی تصویر شر وفساد، نفرت وبیزاری، خیانت اور گھمنڈ وانانیت سے بھرپور ہے۔ چنانچہ اس کی حقیقی تصویر یہ ہے کہ وہ کھیتیوں، پودوں اور پھلوں کو ہلاک کرتا ہے، نیز انسانی

۱- ''من'' یہاں پر تبعیض کے لئے ہے، اس میں لوگوں میں سے ایک فریق کا بھی مصداق بننے کی صلاحیت ہے، نیز متعین شخص کا مصداق بننے کی بھی صلاحیت ہے۔

نسل اور جاندار کے بچوں کو تباہ و برباد کرتا ہے۔ اللہ تعالی نے آیت بالا میں خاص طور پر کھیتیوں اور جانوروں کی تباہی کا ذکر کیا ہے، اس لئے کہ یہی دونوں چیزیں بہ قول ابن حیان ایسی ہیں: ''جن کی دنیا کی آبادی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے، لہذا ان کو تباہ کرنا ہی سب سے بڑا فساد ہے''(۱)۔

ان سارے عیوب وآفات کے مدنظر یہ تصویر سخت نفرت و بیزاری اور ناپسندیدگی کی حامل ہے؛ کیونکہ یہ صرف اعلی و پاکیزہ اخلاق سے ہی متصادم نہیں ہے، بلکہ تنقیدی عقل کے تقاضے سے بھی متصادم ومتعارض ہے، فرمان باری تعالی ہے: ''**كبر مقتاعند الله أن تقولوا مالاتفعلون**''(سورۂ صف:۳)(اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی قابل نفرت ہے کہ وہ کہو جو نہ کرو)، نیز ارشاد الہی ہے: ''**أتأمرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم وأنتم تتلون الكتاب أفلا تعقلون**''(سورۂ بقرہ:۴۴)(کیا تم لوگوں کو نیکی و بھلائی کا حکم دیتے پھرتے ہو اور خود کو فراموش کر بیٹھتے ہو، حالانکہ تم کتاب الہی کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم عقل وخرد سے کام نہیں لیتے؟)۔

بہرحال اس شخصیت کی تصویر میں تناقض و تضاد کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے۔ اس کی باتوں، بھڑکیلے نعروں اور پرفریب سائن بورڈوں اور زمین کے اندر اس کے اعمال، فساد و بگاڑ، کھیتی، نسل انسانی اور جانداروں کو تباہ کرنے کی صورت حال کے درمیان زبردست اور بڑا فرق ہے۔ چنانچہ اس کی شخصیت متناقض ومتضاد ہے۔ اس پہلو سے کہ وہ ''**ألدّالخصام**''(سخت جھگڑالو ہے)، ''**ألد**''صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ دوسرے پہلو سے اس کی شخصیت واقعی صورت حال کی دلیل وشاہد کی محتاج ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ''**وإذا تولى سعى في الأرض ليفسد فيها ويهلك الحرث والنسل والله لايحب الفساد**''(سورۂ بقرہ:۲۰۵)(اور

۱- ابوحیان اندلسی، تفسیر البحر المحیط، مرجع سابق، ج۲، ص:۱۱۸-اس صورت کی مزید معلومات کے لئے: استاذ زیاد خلیل دغامین کی تحریر کی مراجعت کی جائے، دیکھئے: دغامین، زیاد خلیل، ''إعمار الكون في ضوء نصوص الوحي''، مجلۃ اسلامیۃ المعرفۃ، شمارہ:۵۴(۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء)، ص:۵۵-۵۶۔

جب وہ سامنے سے ہٹتا ہے،تو زمین میں اس کی ساری تگ ودواس لئے ہوتی ہے کہ اس میں فساد مچائے، اور کھیتیوں اور نسل انسانی اور جانداروں کو تباہ و برباد کرے، حالانکہ اللہ کو فساد و بگاڑ پسند نہیں ہے)۔

''حرث'' سے اس جگہ کھیتی مراد ہے، اور ''نسل'' سے مراد (ایک قول کے مطابق) جانور سے نکلنے والی چیزیں ہیں۔ یہ ''نسل الصوف نسولا'' سے ماخوذ ہے، یہ اس وقت بولا جاتا ہے، جبکہ اون جانور کی پشت سے جدا ہوکر گر پڑے، اللہ تعالی نے ''حرث ونسل'' کو اس لئے بیان فرمایا ہے کہ انہی دونوں چیزوں پر نزول قرآن کے وقت عربی زندگی کا دارومدار تھا۔ لہذا بہ قول امام محمد طاہر ابن عاشورؒ: ''ان ہی دونوں چیزوں کی تباہی مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان چیزوں کو تباہ کیا جائے جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہو۔ ان کو بہ طور مثال بیان کیا گیا ہے''(۱)۔

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۲،ص:۲۷۰۔

مبحث دوم

انتہا پسندی کے مقابلہ میں توسط واعتدال

۱-انتہا پسندی: انواع واقسام:

(الف) انتہا پسندی کی ایک قسم نفقات واخراجات میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ انتہا پسندی ممنوع ہے۔ اس بات کی دلیل کہ اسراف اور حد سے تجاوز کرنا بھی فساد کے اسباب میں سے ایک ہے، یہ امر ہے کہ اللہ تعالی نے مسرفین اور حد سے تجاوز کرنے والوں کو زمین میں فساد مچانے والا قرار دیا ہے۔ فرمان باری تعالی ہے:"**ولاتطيعو أمر المسرفين، الذين يفسدون فى الأرض ولا يصلحون**" (سورۂ شعراء:۱۵۱-۱۵۲)(اور ظالموں اور حد سے گذرنے والوں کی باتوں میں مت آؤ، جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، اور ان کا اصلاح سے کوئی تعلق نہیں)۔ شاید اسراف کی قسموں میں نمایاں ترین قسم اخراجات میں اسراف ہے۔ ارشاد الہی ہے:"**وكلوا واشربوا ولاتسرفوا إنه لايحب المسرفين**"(سورۂ اعراف:۳۱)(کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، یقیناً اللہ تعالی حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے)۔

امام ابن عاشورؒ نے کبھی ''اسراف'' کی تعریف یوں کی ہے:''لذیذ چیز کی وجہ سے نفس کی تسکین کے لئے کافی مقدار سے تجاوز کرنے کو''اسراف'' کہتے ہیں(۱)، کبھی انہوں نے اس کی تعریف یوں کی ہے:''کسی چیز کے سلسلہ میں معروف حد سے تجاوز کرنے کا نام''اسراف'' ہے''(۲)۔

۱- مرجع سابق، ج۸، ص: ۱۲۳۔

۲- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۸، ص۹۵۔

''اسراف'' کی قوی ترین صورت فساد و بگاڑ، حرام کاموں اور نیکی وصلاح کی مدات کے علاوہ دیگر مدوں میں اموال اور طاقتوں کو خرچ کرنا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**ولاتبذر تبذيرا، إن المبذرين كانوا إخوان الشياطين وكان الشيطان لربه كفورا**''(سورۂ اسراء:۲۶-۲۷)(فضول خرچی مت کرو، یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائیں ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے)، نیز فرمان باری تعالی ہے:''**والذين إذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذلك قواما**''(سورۂ فرقان:٦٧)(اور اللہ کے مخصوص بندے وہ ہیں جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ حد سے تجاوز کرتے ہیں اور نہ ہی تنگی سے کام لیتے ہیں، ان کا خرچ اعتدال کے ساتھ ہوتا ہے)۔

ب؛انتہا پسندی کی ایک قسم ایسی برتری ہے جو سرکشی سے متصل ہو۔ یہ سنگین ظلم و معصیت ہے(۱)، فرمان باری تعالی ہے:''**الذين طغوا فى البلاد فأكثروا فيها الفساد**''(سورۂ فجر:۱۱-۱۲)(جنہوں نے ملک میں سرکشی کی اور وہاں بہ کثرت فساد مچایا)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکشی سرکش انسان کو بالعموم لوگوں کے حقوق تباہ کرنے اور بالخصوص ان میں سے کمزوروں پر حملہ کرنے پر جری بنا دیتی ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**ولا تبخسوا الناس أشياء هم ولا تعثوا في الأرض مفسدين**'' (سورۂ شعراء:۱۸۳)(اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دو، اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرو)۔

یہ سنگین نوعیت کا فساد ہے، جس کے ساتھ قوانین اور نظام ابتری کا شکار ہو جاتے ہیں،

۱- کبھی سرکشی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ سرکش انسان خوشحالی کے کسی درجہ تک پہنچ جاتا ہے، چنانچہ لغت میں ''مترف''(عیاش) اس شخص کو کہتے ہیں جسے نعمت، دولت اور خوشحالی نے اتراہٹ میں مبتلا کر دیا ہو، جس کی بنا پر وہ سرکش ہو گیا ہو۔ اسی لئے اللہ تعالی نے عیاشوں کو تباہی سے ڈرایا ہے، فرمان باری تعالی ہے:''**وإذا أردنا أن نهلك قرية أمرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا**''(سورۂ اسراء:۱٦)(جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں، تو وہاں کے عیاشوں کو حکم دیتے ہیں، وہ وہاں فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان پر عذاب کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے تو ہم اسے تباہ اور تہ و بالا کر دیتے ہیں)۔

اور کینہ وکپٹ اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔موجودہ وقت میں سرکشی ان اداروں کی عدم کارکردگی میں نمایاں ہے،جن کے بارے میں طے تھا کہ وہ سماج کے حقوق کی نگرانی کو انجام دیں،اوران کے ذمہ داروں کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ آزادی اور بااختیار بنانے کے میدان کوشفافیت اورسب کے لئے یکساں مواقع کے لئے وسعت دیں۔

سرکشی کا سنگین نتیجہ جس فساد کی شکل میں نکلتا ہے،وہ یہ ہے کہ جن کے خلاف سرکشی ہوتی ہے وہ بہت جلد سرکشوں کے لئے اپنے دل میں برائی چھپا لیتے ہیں،اوران کے دل سرکشوں کے لئے نفرت وبیزاری کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔سرکشی سے پیدا ہونے والے اس فساد کے سایہ میں کارکنان حکومت اپنے لوگوں سے خوف زدہ رہتے ہیں،اور ہر حال میں ان کے بارے میں برا گمان رکھتے ہیں،،اورانہیں خبردار کرتے رہتے ہیں،یہی وجہ ہے کہ امت کی طاقت اپنے افراد کے خلاف ہی منقسم ہوجاتی ہے،دشمنوں کے خلاف متحد نہیں ہو پاتی ہے،اس طرح امت کے اندر اور باہر دونوں محاذوں پر دشمن ہوتے ہیں،جو سنگین فساد کا سبب بنتا ہے،سو یقیناً سرکشی کثرت فساد کا سبب ہے(۱)۔

ج-انتہاپسندی کی ایک قسم فرد اور سماج کی مصلحت کے درمیان توازن کا معدوم ہونا ہے،اگر فرد کی مصلحت مال کمانے اور عمل اور جائز ثروت ودولت میں اضافہ کرنے کی سعی وکاوش کے ذریعہ مالدار بننے میں ہے تو سماج کی مصلحت کی نمایاں صورت یہ ہے کہ اموال کی تحصیل،ان کے خرچ کے مدات اوران سے فائدہ اٹھانے کے طریقوں پر نگرانی رکھی جائے،اس جگہ اسراف کی نمایاں صورت یہ ہے کہ دونوں مصلحتوں کے درمیان توازن بگڑ جائے،جبکہ مطلوب یہ ہے کہ معاشرہ وسماج کی مصلحت حد سے تجاوز نہ کرے کہ فرد کو بیڑیوں میں جکڑ دے،اوراسے اپنی کمائی کے ثمرات وفوائد سے لطف اندوز ہونے سے روک دے،اسی طرح یہ بھی مطلوب ہے کہ فرد کی مصلحت اپنی حد سے تجاوز نہ کرے کہ سماج کے حقوق ضائع ہوجائیں۔

۱- ابن عاشور،التحریر والتنویر،مرجع سابق،ج۳۰،ص۳۲۱۔

استاذ سید قطبؒ رقم طراز ہیں: ''اسلام انفرادی ملکیت کا معترف ہے، اور اس انفرادی کوشش کا احترام کرتا ہے جو حلال ذرائع سے انفرادی ملکیت کی تحصیل کی خاطر صرف کی گئی.....وہ انفرادی جدوجہد کا درجہ نہیں گھٹاتا ہے، یا اسے کالعدم نہیں کرتا ہے، لیکن وہ خود اسی وقت میں انفرادی ملکیت میں تصرف کرنے کا متعین طریقہ طے کرتا ہے..... یہ ایک متوازن ومتوسط طریقہ ہے۔ اس میں فرد اپنی جدوجہد کے ثمرہ سے محروم نہیں ہوتا ہے، اور عیش پسندی اور عیاشی کی حد تک اس سے لطف اندوز ہونے کے سلسلہ میں بے محابہ آزاد بھی نہیں رہتا ہے، اور نہ ہی اسے تنگی کرنے کے حد تک مال کو روکنے کی کھلی چھوٹ ملتی ہے، نیز اسلام اس مال کے اندر جماعت کے حقوق بھی طے کرتا ہے''(۱)۔

د- انتہا پسندی کی ایک قسم سزا دینے میں مبالغہ کرنا اور حد سے بڑھنا ہے۔ یہ امر مخفی نہیں ہے کہ بدکار کو اس کے ارتکاب کردہ بدی و برائی کی سزا دینا ایک صالح اور نفع بخش عمل ہے۔ ہاں، اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اگر سزا ارتکاب کردہ غلط و فاسد عمل کے مناسب درجہ سے تجاوز کر جائے، تو یہی سزا غلط عمل میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ فرمان باری تعالی ہے: ''**وإذا بطشتم بطشتم جبارين**'' (سورۂ شعرا: ۱۳۰) (جب تم گرفت کرتے ہو تو سرکشوں کی طرف گرفت کرتے ہو)(۲)۔ اللہ تعالی کی قسم! گرفت انتہا پسندی کے لحاظ سے ظلم کی ان سنگین قسموں میں سے ایک ہے، جن سے آبادی کی ویرانی و بربادی کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف علامہ ابن خلدونؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: ''جان لو کہ: ظلم کو حرام قرار دینے کے سلسلے میں شارع کی مطلوبہ حکمت یہی ہے کہ اس سے آبادی میں فساد و بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور آبادی برباد ہوتی ہے۔ یہ چیز اس بات کو بتاتی ہے کہ نوع انسانی کا خاتمہ ہوجائے، نیز یہی وہ عمومی حکمت ہے

۱- قطب، فی ظلال القرآن، مرجع سابق، ج ۲، ص: ۲۷۱۲۔

۲- امام محمد طاہر بن عاشورؒ تحریر فرماتے ہیں: ''افراط وتفریط کے بغیر سزا کو اس گناہ کے مناسب ہونا چاہئے جس پر سزا دی جارہی ہے۔ گرفت کرنے میں افراط یہ ہے کہ مخلوق کے حقوق کا مذاق اڑایا جائے۔ دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۱۹، ص ۱۶۹۔

جس کی رعایت شریعت کی طرف سے اس کے پانچوں ضروری مقاصد: دین، نفس، عقل، نسل اور مال کے تحفظ کے سلسلے میں کی گئی ہے(۱)۔

یقیناً انسانی آبادی، خواہ بلند وبالا برجوں اور محلوں کی تعمیر، کئی میل عبور کرنے والی میزائلوں کے بنانے، جیٹ طیارے سازی اور بڑے بڑے شہر کی نقشہ سازی کی قسم سے ہو، یہ ایک ناقص آبادی ہے جو ختم ہونے کی زد میں ہے، اگر روحانی اور اجتماعی امن وامان پر اس کی بنیاد نہ ہو۔ اس سے ہم ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے اصلاحی مقصود کو سمجھ سکتے ہیں، جو فرمان باری تعالی میں وارد ہے: "**رب اجعل هذا بلدا آمنا وارزق أهله من الثمرات من آمن منهم بالله واليوم الآخر، قال ومن كفر فأمتعه قليلا ثم اضطره إلى عذاب النار وبئس المصير**" (سورۂ بقرہ:۱۲۶) (اے میرے رب! اسے پرامن شہر بنادے، اور یہاں کے باشندگان کو پھلوں سے روزی عطا کر، جو ان میں سے اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے۔ اللہ تعالی نے فرمایا: اور جو کفر اختیار کرے گا اسے بھی میں تھوڑی مدت مال ودولت سے لطف اندوز ہونے کا موقع دوں گا، پھر اسے جہنم کے عذاب کی طرف دھکیل دوں گا، اور وہ برا ٹھکانا ہے)(۲)۔

ھ- انتہا پسندی کی ایک قسم یہ ہے کہ مختلف مادی مظاہر کے اندر عمرانی تعمیر کا خوب اہتمام کیا جائے، اور انسان کی روحانی تعمیر اور اس تعمیر میں انسانوں کے درمیان جو تعارف اور نیکی اور تقوی کے کاموں میں تعاون شامل ہے، اس سے غفلت برتی جائے، اور اسے نظر انداز

۱- ابن خلدون، عبد الرحمٰن بن محمد، مقدمہ ابن خلدون، بیروت، دار الجیل العربی، (د،ت)، ص:۳۱۸-۳۱۹۔

۲- امام ابن عاشورؒ تحریر فرماتے ہیں: "ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا نبوت کے جامع و مانع الفاظ میں سے ہے؛ کیونکہ ملک اور آنے جانے کے راستوں کی امن وامان میں زندگی کی سعادت وخوشحالی کی تمام باتیں لازمی طور پر آگئیں، نیز اس میں عدل وانصاف، غلبہ واقتدار اور خوشحالی سب آگئے، اس لئے کہ ان چیزوں کے بغیر امن وامان حاصل نہیں ہوسکتی ہے، نیز اس کا لازمی تقاضا آبادکاری، نفع بخش چیزوں اور ثروت ودولت کی طرف متوجہ ہونا ہے، چنانچہ پہلی تینوں چیزوں میں جب خلل واقع ہوگا، تبھی امن میں خلل واقع ہوگا۔ اور جب امن میں خلل واقع ہوگا، تبھی اخیر کے تینوں امور میں خلل واقع ہوگا، دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ا ص ۷۱۵۔

کر دیا جائے۔قرآن مجید نے ہمارے سامنے انسانیت کی تاریخ کے ان تجربات اور مشاہدات کو پیش کیا ہے، جن کے حاملین نے انسانی آبادی کے مادی پہلو کا صرف اہتمام کیا، اور انسانی وجود کے روحانی رخ و پہلو کا انہوں نے کوئی اہتمام نہیں کیا۔ یہ ہود، عاد، ثمود، فرعون، باغ والے اور دو باغ والے کے قرآن کے پیش کردہ واقعات میں بالکل واضح ہے۔

ہود کی قوم نے زمین کی آبادی کا بڑا اہتمام کیا، یہاں تک کہ ان کی توجہات بلند و بالا عمارتوں اور ان اونچے اونچے میناروں کی تعمیر میں منحصر ہو گئیں، جن سے مسافر اور راہ رو اپنے راستے میں رہنمائی حاصل کریں، اسی طرح انہوں نے بلند زمینوں میں محل اور پانی کے کارخانے بنائے، انہوں نے پانی کو ایسے حوضوں اور ٹینکوں میں محفوظ کیا جو سردی میں بارش کے پانی کو جمع کر لیں، مسافر افراد اور شہروں اور آبادیوں میں رہنے والے حضرات فائدہ اٹھائیں، خواہ قحط کا زمانہ ہو یا بارش کی کمی کا زمانہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے کام دنیوی اعمال کی قسم سے ہیں، جن سے لوگ اپنے وجود اور زندگی میں فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان سے ان کی معیشت آسان ہوتی ہے، یہ ساری چیزیں لوگوں کے لئے نفع بخش ہیں، اس لئے کہ ان سے ہلاکت اور پیاس سے ان کا تحفظ ہوتا ہے۔اس وجہ سے یہ اعمال اس حیثیت سے قابل مدح وثنا ہیں، اور اس لائق ہیں کہ ان کو پسند کیا جائے، لیکن اگر ان عمال میں رضائے الٰہی کو نظر انداز کر دیا جائے، اور یہ خالص ریا، سرکشی اور آخرت فراموشی پر مبنی ہوں، تو یہی اعمال اپنی افادیت کھو دیں گے، فرمان باری تعالی میں اسی طرف اشارہ ہے:''**الم تر كيف فعل ربك بعاد، إرم ذات العماد، التي لم يخلق مثلها في البلاد،وثمود الذين جابوا الصخر بالواد، وفرعون ذى الأوتاد،الذين طغوا في البلاد فأكثروا فيها الفساد، فصب عليهم ربك سوط عذاب، إن ربك لبالمرصاد**''(سورۂ فجر:۶-۱۴)(کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیسا معاملہ کیا جو کہ بڑے ستونوں کے مانند اونچے و بلند عمارت وقد والے تھے،''ارم'' کی اولادوں

میں تھے اور ''عادارم'' کہلاتے تھے، جن کی مانند ملکوں میں پیدا نہیں کئے گئے، اور ثمود کے ساتھ کیسا معاملہ کیا، جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشیں (اونچی اونچی عمارتیں بنائیں)۔ اور فرعون کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا، جو میخوں والا تھا (سزا کے طور پر لوگوں کے پیروں میں میخیں ٹھوکوا دیتا تھا) جنہوں نے ملک میں سرکشی کی اور بڑا فساد مچایا، تو آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا، یقیناً آپ کا رب گھات میں ہے)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے اعمال لوگوں کی معیشت کو آسان بنانے اور دنیوی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی راہوں کو آسان کرنے کے سلسلے میں اہم تھے، لیکن یہ اعمال اگر سرکشی کا سبب بن جائیں، تو ان سے اچھے مقاصد کی روح سلب ہوجاتی ہے، عاد کے بارے میں قرآن کریم کے بیان کردہ واقعہ میں یہ بالکل واضح ہے، ارشاد الٰہی ہے:''**فأما عاد فاستكبروا في الأرض بغير الحق وقالوا من أشد منا قوة؟أولم يروا أن الله الذي خلقهم هوأشدمنهم قوة، وكانوا بايانتا يجحدون**''(سورۂ فصلت:۱۵)(رہے عاد تو انہوں نے زمین میں ناحق تکبر کیا، اور بولے: ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا، غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے، وہ ان سے بڑھ کر قوت وطاقت والا ہے (حقیقت یہ ہے کہ) یہ لوگ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے)۔ یہ حقیقت فرعون کے بارے میں قرآن کے بیان کردہ واقعہ میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے:''**ونادى فرعون في قومه،قال يقوم أليس لي ملك مصر وهذه الأنهارتجري من تحتي أفلا تبصرون أم أنا خيرمن هذا الذي هو مهين ولا يكاد يبين فلولا ألقي عليه أسورة من ذهب**''(سورۂ زخرف:۵۱-۵۳)(فرعون نے اپنی قوم میں آواز لگائی، اس نے کہا: اے میری قوم! کیا مجھے مصر کی بادشاہت حاصل نہیں، اور یہ نہریں میرے نیچے رواں دواں ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں، کیا میں بہتر ہوں اس سے جو بے حیثیت ہے اور کھل کر بول بھی نہیں پاتا ہے (یا یہ بہتر ہے؟) اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں (آسمان سے) گرائے جاتے)۔

اس طرح ضروری ہے کہ ہم دو حیثیتوں سے مادی عمرانی اعمال کے درمیان امتیاز کریں:

۱-لوگوں کو نفع پہنچانے، ان کی کمائی اور معیشت کی راہیں آسان کرنے کی خاطر اللہ تعالی کی رضا وخوشنودی کا استحضار ہو، تو اس حیثیت سے یہ اعمال دنیا میں تعریف وثنا کے حقدار ہیں، اور آخرت میں باعث ثواب ہیں۔

۲-لوگوں کو نفع پہنچانے یا ان کو مضرت لاحق کرنے کے سلسلہ میں اللہ تعالی کی رضا وخوشنودی کو نظر انداز کر دیا جائے، اس حیثیت سے اعمال ریا کاری اور آخرت سے غفلت کے ذرائع ہوں گے، نیز یہ محض دنیوی عظمت کے گھمنڈ میں مبتلا ہونے کا سبب ہوں گے، اس وجہ سے یہ مادی عمرانی اعمال عبث وبے فائدہ اعمال کے مشابہ ہیں، فرمان باری تعالی ہے: ''**أتبنون بكل ريع آية تعبثون، وتتخذون مصانع لعلكم تخلدون**'' (سورۂ شعراء:۱۲۸-۱۲۹) (کیا تم ہر جگہ اونچی وشاندار عمارتیں بے فائدہ کھڑی کرتے ہو اور اسی طرح کارخانے بناتے ہو، گویا تم ہمیشہ (اس دنیا میں) رہو گے)۔

امام محمد طاہر ابن عاشورؒ رقمطراز ہیں: ''اعمال اگر ان مقاصد کی رعایت سے خالی ہوں جو اللہ تعالی کو راضی کرتے ہیں، تو مخصوص مصالح کی تحصیل اور ہمتوں کے اختلاف کی بنا پر عمل کو انجام دینے والوں کی راہیں الگ الگ ہوتی ہیں، اسی وجہ سے وعظ ونصیحت کے قانون کے مطابق وعظ ونصیحت کرنے والے رسول نے ان پر نکیر کی؛ کیونکہ وعظ ونصیحت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اعمال کے اندر لوگوں کے مرغوب نفع کے مقابلہ ''راجح ضرر'' کی رعایت کی جائے، اس لئے کہ لوگوں میں موجود رغبت کا محرک اس سلسلے میں انہیں ترغیب دلانے سے بے نیاز کر دیتا ہے، واعظ کا اس کے درپے ہونا عبث وبے فائدہ ہے، نیز مقصد سے نکل جانا ہے، جو کہ یہ ہے کہ اس صورت کے علاوہ دیگر صورتوں کے سلسلے میں لوگوں کو خبردار کیا جائے، یا انہیں آمادہ کیا جائے''(۱)۔

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۱۹، ص۱۶۶۔

۲-''توسط''واعتدال:

اس طرح انتہا پسندی کی جگہ ''توسط''اور''اعتدال'' ضروری ہے، اس لئے کہ انتہاپسندی استقامت سے منحرف ہوجانے کا نام ہے،انحراف ہمیشہ صرف تشدد یا غلو کی سمت میں ہی رخ نہیں کرتا ہے بلکہ اخلاقی زوال اور گراوٹ کی طرف بھی رخ کرتا ہے۔ جبکہ مطلوب مناسب واپسی ہے، مقابل جہت کی طرف واپسی نہیں ہے، بلکہ دائمی مطلوب یہ ہے کہ مناسب توسط کی طرف مناسب واپسی کی جائے(۱)۔

اسراف کی جگہ اس توسط واعتدال کی طرف میلان ہونا چاہئے ،جس میں اس تشدد کی طرف جھکاؤ نہ ہو،جس پر عام لوگ اور اکثریت قادر نہیں ہے، نہ اس گراوٹ وانحطاط کی طرف جھکاؤ ہو، جو لوگوں سے ذمہ داری کے احساس کو ختم کردے، ہم محض نظریاتی حسابی میزان وترازو کے ذریعہ'' توسط'' کو نہیں سمجھ سکتے ہیں، یہاں تک کہ ہمیشہ یہ کہیں کہ''اصلاح''مثال کے طور پر افراط وتفریط کے درمیان'' توسط'' کے اندر پائی جاتی ہے(۲)۔

۱- امام شاطبیؒ نے ان الفاظ میں اس کا عمیق بیان فرمایا ہے:''اگر تم شرعی کلیہ پر غور کروگے تو تم پاؤگے کہ وہ توسط واعتدال پر آمادہ کرتا ہے،اگر تم کسی طرف میلان پاؤگے،تو وہ دوسری طرف میں ہونے والی یا متوقع کمی کے مقابلہ میں ہوگا، چنانچہ تشدید کی جہت، جو عام طور سے تخویف، ترہیب اور زجر کے موقع پر ہوتی ہے،اس شخص کے سلسلہ میں بیان کی جاتی ہے جس پر دینی گراوٹ وانحطاط غالب ہو، جبکہ تخفیف کی جہت جو عام طور سے ترغیب، ترخیص اور امید دلانے کے موقع پر ہوتی ہے،اس شخص کے لئے بیان کی جاتی ہے جس پر تشدید کی تنگی غالب ہو، اگر پہلی اور دوسری صورت موجود نہ ہو،تو پھر تم دیکھوگے کہ توسط اور مسلک اعتدال ہی واضح اور عیاں ہے، دیکھئے: شاطبی، ابواسحاق، ابراہیم بن موسی، الموافقات فی اصول الشریعۃ،تحقیق:عبداللہ دراز، بیروت،دارالمعرفہ(د،ت)،ج۲،ص:۱۶۷-۱۶۸۔

۲- یہ بات یونانی قول کے اتباع میں کہی جاتی ہے،جس کے مطابق انسان اپنی عقلی،شہوانی اور غضب سے متعلق قوتوں کے استعمال کے سلسلے میں افراط وتفریط کی زد میں ہے، یہی وجہ ہے کہ فضیلتوں کا دارومدار توسط واعتدال پر ہے، ایسے ہی اخلاق حسنہ افراط وتفریط کی دو انتہاؤں کے درمیان ہے، اسی طرح شجاعت بزدلی اور انجام سوچے سمجھے بغیر خطرناکیوں میں کود پڑنے اور بلاسوچے اقدام کرنے کے درمیان معتدل خصلت ہے،''کرم وفیاضی'' بھی بخل وکنجوسی اور فضول خرچی کے درمیان معتدل خصلت ہے،''عفت وپاکدامنی'' بھی بے حیائی اور بدکاری اور بے حسی وعدم احساس کے درمیان کی حالت ہے،اس سلسلہ میں عمر ممدوح مصطفیٰ کی کتاب''اصول تاریخ القانون''ص:۸۵ کی مراجعت کی

''توسط'' کو ہم عملی تقویمی (قدر و قیمت پر مبنی) میزان وترازو کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں، جس میں لوگوں کے احوال کو اولویت وترجیح دی جاتی ہے، ان کی صورت حال کی رعایت کی جاتی ہے، اس فہم کے حامل کی حالت مریض کے ساتھ ماہر طبیب کی حالت کے مشابہ ہے، چونکہ ماہر طبیب مریض کی فطرت سے واقف ہوتا ہے، لہذا وہ اس بات سے باخبر ہوتا ہے کہ اس وقت اور آئندہ اس کی درستگی کس چیز میں ہے، پس ماہر طبیب وہ ہے جو مریض کو اس بات پر آمادہ کرے، جس میں اس کا علاج اور صحت ہو، اس بات کا فیصلہ محض اپنی معلومات کی بنیاد پر نہ کرے، بلکہ مرض کی نوعیت اور شدت کے سلسلے میں مریض کی حالت کے لحاظ سے فیصلہ لے۔ نیز اس کی عادتوں کے نتیجے میں جو مختلف حقائق سامنے آئیں ان کو مدنظر رکھے۔

علاج ومعالجہ کے بارے میں فیصلہ کن چیز محض طبیب کی یادداشت میں پائی جانے والی معلومات یا دواؤں کی زبانی یادشدہ معلومات ہی نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ میں دو باتیں فیصلہ کن ہیں: پہلی بات مرض کی حالت کی طبیب کی علمی اور گہری تشخیص ہے، نیز دواؤں کی مقدار، ان کے استعمال کی کیفیت، تناسب اور اوقات سے طبیب کی واقفیت ہے۔ اس علمی عمل کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ توسط واعتدال کی راہ یہ ہے کہ لوگوں کے حالات کو پرکھا جائے اور ہمیشہ قرآن کریم اور اس کے مقاصد کی میزان وترازو کے ذریعہ ان کا اندازہ لگایا جائے۔ لہذا قرآنی توسط واعتدال خالص اطلاقات کے سمندر میں نہیں تیرتا ہے، بلکہ لوگوں کے برتاؤ کو محیط احوال کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اس کی تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، کبھی ان حالات کا تقاضا یہ ہوگا کہ مناسب ''تشدید'' اختیار کی جائے، کبھی ان احوال کا تقاضا یہ ہوگا کہ مناسب ''تخفیف'' اختیار کی جائے۔ ''توسط'' واعتدال لوگوں کی صورتحال کے ہمارے تجزیہ کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے، توسط صرف یہ نہیں ہے کہ مناسب حالت ہونی چاہئے، بلکہ اسے لوگوں کی صورت حال کے بھی مطابق

جائے، استاذ عباس محمود عقاد نے ہم سے پہلے اس فہم پر اعتراض کیا ہے، انہوں نے اس بات کو نوٹ کیا کہ اس فہم کا حامل اخلاقیات کے بارے میں نفسیاتی محرکات اور روحانی اقدار کا کوئی احترام نہیں کرتا ہے، عقاد، عباس محمود، حقائق الاسلام واباطیل خصومہ، قاہرہ، المؤتمر الاسلامی، ط: ۱، ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء، ص: ۲۸۳۔

ہونا چاہئے ،لہذا ہماری زندگی میں پیش آنے والے چند مسائل یا کسی ایک مسئلہ میں توسط کو جاننے کے لئے ہمیں پوری علمی کوشش وکاوش کرنی ہوگی، اسی سعی وکاوش کی وجہ سے امت اسلامیہ توسط واعتدال کی صفت کی حقدار ہے۔فرمان باری تعالی ہے:''**وکذلک جعلناکم أمة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا**''(سورۂ بقرہ: ۱۴۳)(اس طرح ہم نے تمہیں معتدل امت بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں کے حق میں گواہ بنواور رسول تمہارے حق میں گواہ بنیں)۔

اس آیت میں'' توسط'' کوان خوبیوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے جن سے امت مسلمہ کومتصف ہونا چاہئے ،اسی کی بنا پر وہ انسانیت کی قیادت اور خیر وبھلائی کی طرف دیگر قوموں کی رہنمائی کی اہل ہوگی۔امت مسلمہ اس خوبی سے جس قدر متصف ہوگی اسی قدر اللہ تعالی کی ثنا کی مستحق ہوگی، نیز موجودہ دنیا میں عملی اور واقعاتی لحاظ سے خیر وبھلائی کی طرف دیگر قوموں کی رہنمائی کر سکے گی ،فرمان الٰہی :''**لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا**''(تاکہ تم لوگوں کے حق میں گواہ بنو، اور رسول تمہارے حق میں گواہ بنیں)علت یا مقصد کے درجہ میں ہے، یعنی اسلام کے مختلف احکام کی پابندی کی ذمہ داریوں کو انجام دینے اور عمل کے ذریعہ ہی تم اس قیادت اور شہادت کے اہل بنو گے،'' توسط'' ایک سبب ہونے کی حیثیت سے ''صلاح'' اور'' اصلاح'' کو وجود میں لاتا ہے، وہ محض اخلاقی خوبی نہیں ہے، اس لئے کہ وہ ایک منہجی طرز و برتاؤ ہے جو امت مسلمہ کو اہل بناتا ہے کہ وہ لوگوں کے حق میں شہادت وگواہی اور معلّمی ورہبری کے منصب پر فائز ہو۔قرآن مجید میں وارد'' توسط'' (۱) کا مطلب امتیاز ہے جو محض

۱- '' توسط'' سورۂ قلم کی آیت نمبر:۲۸ میں بھی وارد ہے، ارشاد الٰہی ہے:''**قال أوسطهم ألم أقل لکم لولا تسبحون**'' (سورۂ قلم:۲۸)(منجھلے بھائی نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم اللہ کی پاکی وتسبیح کیوں بیان نہیں کرتے)۔'' اوسط'' سے مراد: سب سے زیادہ عقل مند، نیک، صواب ودرستگی اور خیر وبھلائی سے سب سے زیادہ قریب ہے۔'' وسط'' کا لفظ سورۂ عادیات میں بھی وارد ہے: فرمان باری تعالی ہے:''**والعادیات ضبحا، فالموریات قدحا، فالمغیرات صبحا، فأثرن به نقعا فوسطن به جمعا، إن الإنسان لربه لکنود**''(سورۂ عادیات:

امت مسلمہ کی طرف خاندانی، یا قومی، یا تاریخی انتساب سے حاصل نہیں ہوتا ہے، بلکہ دین اسلامی کے پیش کردہ تعلیمات وہدایات پر استقامت، علم وقدرت اور جانفشانی سے حاصل ہوتا ہے(۱)۔ان ہی اوصاف وذرائع سے ''توسط'' پیدا ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ امام محمد طاہر ابن عاشورؒ کے بقول: ''بغیر کسی کمی بیشی کے ہر چیز کو اس کا حق دیا جائے''(۲)۔

۱-۶)(قسم ہے ان گھوڑوں کی جو پھنکارے مارتے ہیں، اور (اپنی ٹاپ کی چوٹ ورگڑ سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں، اور صبح سویرے حملہ کردیتے ہیں، اور پھر گردوغبار اڑاتے، فوجوں کے جمگھٹوں کے بیچ میں گھس جاتے ہیں (یہ گھوڑے مجازی مالک کے کتنے وفادار اور خدمت گذار ہیں، دوسری طرف انسان کیسا بے وفا ہے) انسان اپنے مالک کا بڑا ناشکرا ہے)، یعنی گھوڑے لوگوں کے انبوہ کے بیچ میں ہوتے ہیں، یہ اس اقدام کا نتیجہ ہے جن کی خاطر گھوڑے دوڑائے گئے، اور گھوڑوں نے اپنی ٹاپ کی رگڑ سے چنگاریاں جھاڑیں اور صبح سویرے حملہ کیا، سنت نبویہ میں بھی ''توسط'' کا لفظ وارد ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا، ان سے کہا جائے گا: آپ نے توحید کا پیغام پہنچادیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں، پھر ان کی قوم بلائی جائے گی، اور ان سے پوچھا جائے گا: کیا تمہارے نبی نے اللہ کا پیغام تمہیں پہنچادیا تھا؟ وہ بولیں گے: ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، اور کوئی پیغمبر گواہی دے گا؟ وہ کہیں گے: محمد ﷺ اور ان کی امت، یہی ارشاد الٰہی: ''**وكذلك جعلناكم أمة وسطا**'' (سورۂ بقرہ: ۱۴۳) (ہم نے اسی طرح (اے مسلمانو!) تم کو درمیانی اور افضل امت بنایا ہے)۔روای کہتے ہیں: ''وسط'' سے مراد متوسط ومعتدل ہے، دیکھئے: شیبانی، احمد بن حنبل، ''مسند الامام احمد''، تحقیق: شعیب ارناؤوط ودیگر، بیروت، مؤسسۃ الرسالہ، ط:۲، (۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء)، ج۱۷، ص: ۳۸۳، حدیث نمبر: ۱۱۲۸۳- بخاری، صحیح البخاری، مرجع سابق، احادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالی: ''**إنا أرسلنا نوحا إلى قومه أن أنذر قومك من قبل أن يأتيهم عذاب أليم**'' (سورۂ نوح:۱) اخیر سورہ تک، حدث نمبر: ۳۳۳۹۔

۱- عربوں کے یہاں سپہ سالار بیچ میں ہوتا ہے، یعنی اس کے ایسے اخلاقی اور علمی اوصاف ہوتے ہیں جو اسے ممتاز پوزیشن پر فائز ہونے کا اہل بناتے ہیں، یعنی وہ قلب میں ہوتا ہے جو دائیں، بائیں، اگلے اور پچھلے دستے کے درمیان ہوتا ہے، اس طرح سپہ سالار وہ محفوظ شخص ہوتا ہے، جس پر اور جس کی خاطر جنگ کی چکی گھومتی ہے، بہ الفاظ دیگر: محض جغرافیائی، یا تاریخی، یا قبائلی یا خاندانی انتساب کی بنا پر انسانیت کی قیادت وزعامت حاصل نہیں ہوتی ہے، بلکہ اللہ تعالی کی شریعت کے نفاذ وتطبیق کے عزم مصمم اور صحیح ونفع بخش علم کے ذریعہ قیادت حاصل ہوتی ہے۔

۲- ابن عاشور، ''اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام'' مرجع سابق، ص ۲۴، نیز دیکھئے: ہمارا مقالہ: حسنی، اسماعیل، ''تدبیر الشأن الدینی فی المغرب الراہن ومفہوم التوسط فی الإسلام، ندوۃ الخصوصیۃ الدینیۃ المغربیۃ ومساہمتہا فی مواجہۃ الغلو والتطرف، مراکش: کلیۃ الآداب، ۳۰ رمئی، ۲۰۱۵ء۔

''صلاح''اور''فساد''میں سے ہر ایک کے تشکیلی اسباب کے بارے میں خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان سے اس طریقہ کے خدوخال متعین ہوتے ہیں، جس سے قرآن مجید میں وارد اصلاح کے قضیہ کا حل نکلتا ہے۔

اس قضیہ کا مرجع دو تفصیلی سبب ہے، پہلا سبب: وہ جمود و تناقض ہیں جو فساد کا ذریعہ ہیں، جس کا لازمی تقاضا وہ تدافع ہے جس کے ذریعہ صلاح وجود میں آتی ہے، دوسرا سبب وہ اسراف ہے جو فساد کا ذریعہ ہے، جس کا لازمی تقاضا وہ توسط ہے، جس کے ذریعہ صلاح وجود پذیر ہوتی ہے، صلاح و فساد میں سے ہر ایک کی کئی شکلیں اور مثالیں ہیں جن کا استقراء اس بات کا ذریعہ ہے کہ ان کو مخصوص مظاہر میں منحصر کیا جائے، جن میں سے ایک دوسرے تک پہنچائے، اور ایک کی تاسیس دوسرے کے لئے کی جائے، چنانچہ اعتقادی مظہر وہ بنیاد ہے جس کی درستگی سے تفکیری مظہر کی درستگی ہوگی، نیز تفکیری مظہر سے عملی مظہر کی درستگی ہوگی، خواہ نفسیاتی رخ پر ہو یا بدنی رخ پر ہو، یا تدبیری رخ پر ہو۔

فصل دوم

اعتقاد کو درست کرنے کا مظہر

یقیناً سب سے پہلے قرآن کریم نے جس چیز کی اصلاح کا اہتمام کیا ہے، وہ عقائد ہیں، جن پر ایک انسان ایمان رکھتا ہے، اور سماج اور قوم جن سے مطمئن ہوتی ہے، یہ امر مخفی نہیں ہے کہ ہم سب انسان ہیں، جس چیز کے حق ہونے اور توہمات، ضلالتوں اور گمراہیوں سے دور ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں، ان ہی کی بنیاد پر اس کائنات میں تگ ودو کرتے ہیں، سرگرمیاں انجام دیتے ہیں اور تصرف کرتے ہیں، جس طرح ہم اس چیز کی روشنی میں اپنے موقف کی تشکیل کرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں، جس کے بارے میں ہمارا تصور ہو کہ وہ صحیح ہے اور غلطیوں اور عیوب وآفات سے دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ امام محمد طاہر بن عاشورؒ نے اس کا صحیح ادراک فرمایا ہے کہ ''عقیدہ تفکیر کی بنیاد ہے، اور یہی انسان کی ضروریات سے باہر کی چیزوں کے بارے میں اس کی پہلی فکر ہے، اگر صحیح اعتقاد پر عقل کی تربیت کی جائے تو وہ گمراہ کن توہمات میں مبتلا ہونے سے پاک وصاف رہے گی، اور صحیح معلومات اور حقائق کے پرکھنے پر اسکی نشونما ہوگی (۱)۔

بنابریں، اگر تفکیر کی بنیاد اعتقاد پر ہو تو عمل کی اساس بھی تفکیر پر ہوگی؛ اس لئے کہ ہم مختلف سرگرمیوں اور اعمال کے میدان میں اعتقادی ہتھیار یا فکری اثاثہ وساز وسامان سے خالی ہوکر، خواہ اس کی نوعیت اور سطح کچھ بھی ہو، نہیں داخل ہوتے ہیں، اس اعتقادی اور فکری اساس کے مدنظر ہم قرآن مجید میں ایمان کے عمل صالح کے ساتھ مربوط ومتصل ہونے کے مقصود کو سمجھ

۱- ابن عاشور، ''اصول النظام الاجتماعی فی الإسلام''، مرجع سابق، ص:۵۱۔

سکتے ہیں، اس لئے کہ عمل صالح ایمان کا ثمرہ ہے، ایک سے دوسرے کو غذا اور تقویت حاصل ہوتی ہے، قرآن مجید کے استقراء کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل صالح ہر وہ کامیابی ہے جو ایمان پر مبنی ہو اور اس سے وجود میں آئے، اس سے ہم ان قرآنی آیات کی کثرت کا راز سمجھ سکتے ہیں، جو ایمان اور عمل صالح کو مستحکم طور پر مربوط کرتی ہیں، ان ہی آیات میں سے فرمان باری تعالی ہے: ''**وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم فى الأرض** .....'' (سورۂ نور:۵۵) (اللہ کا ان لوگوں سے وعدہ ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور عمل صالح کئے کہ وہ انہیں زمین میں جانشین بنائے گا اور اقتدار بخشے گا)۔ ایک دوسری آیت ہے: ''**من عمل صالحا من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فلنحيينه حياة طيبة ولنجزينهم أجرهم بأحسن ماكانوا يعملون**'' (سورۂ نحل:۹۷) (جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی سے نوازیں گے، اور انہیں ان کے بہترین اعمال کا بہترین بدلہ دیں گے)۔ ایک تیسری آیت میں یوں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''**إن الذين آمنوا والذين هادوا والنصارى والصابئين من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحا فلهم أجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولاهم يحزنون**'' (سورۂ بقرہ:۶۲) (یقیناً جو لوگ مومن ہیں اور جو یہودی، نصرانی اور صابی ہیں ان میں سے جو حقیقتاً اللہ، روز آخرت پر ایمان رکھیں گے اور نیک عمل کریں گے، ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر و ثواب ہے، نہ ان کو خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے)۔

قرآن کریم میں وارد اصلاح کے مفہوم کے اعتقادی مظہر کو واضح کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ ''صلاح'' یا ''فساد'' کے مادہ میں سے قرآن مجید میں وارد مفردات والفاظ اور دیگر باہم مغایر الفاظ کو جمع کیا جائے، اگر اس باب سے متعلق ''صلاح'' اور ''فساد'' کے مادہ کے مفردات والفاظ پر ہم اکتفا کریں گے، تو چھان بین کرنے والا شخص خود کو ایک اساسی حقیقت کے سامنے پائے گا، جس کے بارے میں قرآن مجید میں خبردار کیا گیا ہے، جو یہ ہے کہ اعتقاد کے مسائل میں حق کو حکم

وفیصل بنانے کی خاطر حق کی طرف رجوع کرنا لازم ہے، اعتقادی مسائل میں سرفہرست: اللہ تعالی کی وحدانیت پر ایمان، دوبارہ زندہ کئے جانے پر ایمان اور روز آخرت میں حساب اور سزا پر ایمان کے مسائل اور دیگر ایمانی مسائل ہیں، فرمان باری تعالی ہے: "**ولو اتبع الحق أهواء هم لفسدت السماوات والأرض ومن فيهن**" (سورۂ مومنون:۷۱) (اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو آسمان اور زمین اور ان کے اندر جو مخلوقات ہیں سب تباہ ہو جاتیں)۔

دنیوی زندگی اور کائنات کے اندر ایمان کی سیادت اور اس کے تقاضے کے غلبہ کی وجہ سے ہی ایک انسان کے اندر صلاح و درستگی پیدا ہوتی ہے، اور سماج اور قوم میں بھی صلاح وجود پذیر ہوتی ہے۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ جزا اور بدلہ کے لئے انسانوں کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا، تو اس کا لازمی اور ثابت شدہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی عمل پر کوئی جزا و بدلہ نہیں ہے، چنانچہ لوگ کبھی خیر و بھلائی و نیکی کے کام انجام نہیں دیں گے؛ کیونکہ اجر و ثواب کی کوئی امید نہیں ہے، وہ تو صرف برائی کریں گے؛ کیونکہ سزا کا کوئی ڈر نہیں ہے.....لہذا اگر حق لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا، پھر شر خیر پر غالب آجاتا اور باطل حق پر مسلط ہو جاتا، اور اس میں زمین و آسمان میں رہنے والوں کی تباہی ہے۔

مبحث اول

حقیقت وحدانیت کا اصول اور آسمان وزمین کی تباہی

اس طرح اعتقاد کے بگاڑ کا سب سے پہلا مظہر یہ ہے کہ اعتقادی حقائق سماجی زندگی پر غالب نہ ہوں، جن میں سرفہرست: اللہ تعالی کی وحدانیت ہے، جس کا نہ بیٹا ہے اور نہ باپ ہے، دوسری اعتقادی حقیقت یہ ہے کہ جزا کی خاطر بعث بعد الموت (مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا) پیش آ کر رہے گا۔ تیسری اعتقادی حقیقت یہ ہے کہ ساری کائنات ایک خالق کی تخلیق ہے، اس لئے کہ نظام کائنات میں جو وحدت وہم آہنگی دیکھی جارہی ہے، جس کا سخت ملحد بھی انکار نہیں کرسکتا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک معبود کے ایک ارادہ سے بنایا گیا ہے۔ وہی معبود برحق ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے، اس کا ناموس وقانون محبت ونفرت، رغبت وخوف، غضب ورضامندی اور نشاط وسستی جیسی طاری ہونے والی خواہشات اور دیگر طاری ہونیوالے احساسات کی پیروی نہیں کرتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو آسمان، زمین اور ان میں موجود چیزیں، حالات، پیمانے اور معیارات ومقاییس سب درہم برہم ہوجاتے۔

انضباط وہم آہنگی کے اصول کے مدنظر اسلام نے انسانی زندگی سے متعلق قانون کو بھی اس کلی ناموس وقانون کا حصہ قرار دیا ہے جسے اللہ تعالی سنبھالے ہوئے ہے، اس حال میں کہ وہی ساری کائنات کا مدبر ومنتظم ہے اور وہی اس کے اجزاء اور اس کے مختلف مظاہر کو اپنے قوانین کے ذریعہ ہم آہنگ کئے ہوئے ہے۔ انسان بھی چونکہ اس کائنات کا حصہ ہے، لہذا وہ بھی کائنات سے متعلق بڑے ناموس وقانون کے تحت ہے، اس لئے یہی مناسب تر امر ہے کہ اس حصہ کے

لئے بھی وہی قانون بنائے، جو ساری کائنات کے لئے قانون جاری کرتا ہے اور حیرت ناک ہم آہنگی کے ساتھ اس کا انتظام فرمارہا ہے۔

اس طرح انسانی نظام ذاتی خواہشات اور شخصی انانیت کے تابع نہیں رہتا ہے کہ وہ خلل پذیر ہو اور تباہی و بگاڑ کا شکار ہو جائے(۱)۔

خلاصہ کلام یہ کہ خالق سبحانہ تعالی کا اعتقاد اگر چہ قرآن مجید میں وارد اعتقادی حقائق کا بنیادی اصول ہے، لیکن مشرکین کی خواہش نفس نے کمال الٰہی کی صورت گری اس طرح کی کہ اس کی اولاد ہو۔ اگر یہ خواہش نفس حقیقت ہوتی اور کئی معبود ہوتے تو آسمان و زمین اور ان کے اندر کی چیزیں تباہ و برباد ہو جاتیں۔ فرمان الٰہی ہے:"لو كان فيهما الهة إلا الله لفسدتا"

۱- اس مفہوم سے افادیت کے اس اصول کی مدد و تقویت ہوتی ہے، جو قرآن مجید سے ماخوذ ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:"أفحسبتم أنما خلقناكم عبثا وأنكم إلينا لاترجعون"(سورۂ مومنون:۱۱۵)(کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بے فائدہ وعبث پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹو گے)، نیز فرمان باری تعالی ہے:"أحسب الناس أن يتركوا أن يقولوا آمنا وهم لايفتنون"(سورۂ عنکبوت:۲)(کیا لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہیں ہوگی)۔ نیز فرمان الٰہی ہے:"أيحسب الإنسان أن يترك سدى"(سورۂ قیامہ:۳۶)(کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا)، ایک دوسرے مقام پر اللہ عز وجل کا ارشاد ہے:"وما خلقنا السموات والأرض وما بينهما لاعبين، ما خلقناهما إلا بالحق ولكن أكثرهم لايعلمون"(سورۂ دخان:۳۸-۳۹)(ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کو عبث اور بے فائدہ پیدا نہیں کیا ہے۔ ہم نے ان دونوں (اور ان کے درمیان کی چیزوں کو) برحق پیدا کیا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں)۔

بہر حال "افادیت" قرآنی اصول ہونے کے لحاظ سے ہر موجود، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کا مقصد متعین کرتی ہے، جو مقصد اس کے کردار و عمل کا تعین کرتا ہے، جاننے والے جانتے ہیں اور ناواقف نہیں جانتے ہیں۔ اس قرآنی اصول سے سیرابی کے نتیجہ میں ایک مسلمان اور بدرجہ اولی ایک اسلامی عالم "مصادفات واتفاقات" کی فکر سے نکل کر علمی فکر کے دائرہ میں آجاتا ہے، جس کی بنیاد تعلقات کو سمجھنے اور واضح کرنے پر ہے۔ اس سے عقلی شعور اور ذہنی بیداری کی حالت پیدا ہوتی ہے، جو اسے مختلف سماجی اور کائناتی حقائق کے ساتھ ایسے علمی تعامل کے لئے تیار کرتی ہے جس میں وقتی کامیابی کا قصد ہو اور حقائق کو واضح کرنے والے قوانین کے اجراء ہو، دیکھئے: حسنی، اسماعیل، فقه العلم في مقاصد الشريعة الأعلام المجالات المفاهيم، مراکش، المطبعہ والوراقۃ الوطنیہ، ط:۱، ۲۰۰۴ء، ص:۱۸۲۔

(سورۂ انبیاء:۲۲)(اگر آسمان و زمین میں اللہ کے علاوہ دیگر خدا ہوتے، تو دونوں درہم برہم ہوجاتے)، نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**ماتخذ الله من ولد وما كان معه من إله إذا لذهب كل إله بما خلق**''(سورۂ مومنون:۹۱)(اللہ نے کسی کو اولاد نہیں بنایا، اور اس کے ساتھ کوئی خدا نہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی تخلیق کو لے کر الگ ہوجاتا)(۱)۔

اعتقادی صلاح ودرستگی کے سلسلے میں اس اصولی حقیقت کی اہمیت کے باوجود ہم صرف اسی پر اکتفا نہیں کرسکتے ہیں؛ اس لئے کہ ''صلاح'' اور ''فساد'' کے مادہ کے مفردات والفاظ کے محض استقراء پر اس کا بیان موقوف نہیں ہے، دوسرے الفاظ میں قرآن کریم میں وارد اعتقاد کی صلاح و درستگی ان ارکان کی درستگی کے ساتھ بھی مربوط ہے جن پر ایمان کی بنیاد ہے، نیز اس مناسب تصورات کے ساتھ بھی مربوط ہے جو ایک انسان اپنی ذات، زندگی اور کائنات اور مخلوقات کے بارے میں قائم کرتا ہے۔

۱- اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں، جیسا کہ بعض محققین نے لکھا بھی ہے کہ: ''قرآن کے کفر وشرک اور نفاق پر حملہ کا راز یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں کائنات اور زندگی کو تباہ کردینے والی ہیں، نیز کائنات اور وجود انسانی کے سلسلہ میں صحیح تصور کو ختم کردینے والی ہیں، دیکھئے: دغامین، ''اعمال الكون في ضوء نصوص الوحي''، مرجع سابق، ص:۶۲۔

مبحث دوم
ایمان کے ارکان ومصالح

ان متعدد آیتوں کا حصر نہیں کیا جاسکتا ہے جو اللہ تعالی، روز آخرت، فرشتے، انبیاء ورسل، قیامت اور اچھی بری تقدیر پر ایمان لانے کی دعوت دیتی ہیں، ایک آیت میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: "**فاعلم أنه لا إله إلا الله**" (سورۂ محمد:۱۹) (بہر حال اس کو جان لو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے)، ایک دوسری آیت میں اللہ عز وجل کا فرمان ہے: "**وإذأخذ ربک من بني آدم من ظهورهم ذريتهم وأشهدهم على أنفسهم ألست بربكم قالوا بلى**" (سورۂ اعراف:۱۷۲) (اور اس لمحہ کو یاد کرو جب تمہارے رب نے آدم کی اولاد کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکال کر، ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا، فرمایا تھا: کیا میں تمہارا رب تمہارا خالق ومالک نہیں ہوں؟ تو انہوں نے اعتراف کیا تھا، کیوں نہیں!)۔

اس سیاق میں ہم عقیدہ سے متعلق قرآن کریم کے اصلاحی مقصد کا استحضار کر سکتے ہیں(۱)، کیونکہ قرآن مجید نے دو عظیم چیزوں سے اس کا احاطہ کیا ہے، جن کو امام ابن عاشورؒ نے

۱- عقیدہ توحید چونکہ قرآن کریم میں تفکیر وتخلیق سے متعلق اصلاح کی اساس ہے، لہذا کتاب الٰہی میں عقیدہ توحید کو پختہ ومستحکم کرنے کے لئے تین راہیں اپنائی گئی ہیں۔ پہلی راہ یہ ہے کہ ترہیب وترغیب کو جمع کیا جائے، ترہیب میں وعید وانذار شامل ہے جبکہ ترغیب میں وعد وتبشیر (خوشخبری سنانا) شامل ہے۔ دوسری راہ: قرآن مجید میں غور وفکر کی دعوت ہے، نیز کائنات اور انفس وآفاق یعنی اپنی ذاتوں اور دنیا میں پھیلی ہوئی چیزوں کے سلسلے میں غور وخوض کی دعوت ہے، ارشاد الٰہی ہے: "**قل انظروا ماذا في السموات والأرض وما تغني الآيات والنذر عن قوم لا يؤمنون**" (سورۂ یونس:۱۰۱) (ان سے کہہ دیجئے کہ دیکھو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا ہے؟ اور نشانیاں اور آگاہ کرنے والے (انبیاء ومصلحین) اپنے لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو ایمان نہیں لاتے)، نیز ارشاد باری تعالی ہے: "**أمن هو قنت**

''تفصیل'' اور ''تعلیل'' سے موسوم کیا ہے۔

''تفصیل'' کا مطلب یہ ہے کہ تمام لوگوں کے سامنے صحیح عقیدہ کو واضح کیا جائے، اور گمراہوں کے عقائد کی تذلیل ورسوائی کی جائے، ان کو سخت سست کہا جائے اور شرک کے ذرائع کو

أناء الليل ساجداوقائما يحذر الآخرة ويرجورحمة ربه، قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون إنما يتذكر أولوا الألباب'' (سورۂ زمر:۹) (بتاؤ کہ جو شخص رات کے اوقات میں عبادت میں مشغول رہتا ہے، کبھی سجدہ میں کبھی قیام میں، اور آخرت سے ڈرتا ہے، اور اپنے رب کی رحمت کی امید لگاتا ہے، کیا ایسے اصحاب معرفت، اور جاہل برابر ہوسکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ عقل مند اور دانشمند ہی نصیحت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد الٰہی ہے: ''ن والقلم وما يسطرون'' (سورۂ قلم:۱) (نون (حرف رمز واشارہ) قسم ہے قلم کی اور اس کی جو وہ لکھ رہے ہیں (یعنی آسمان پر فرشتے اور زمین پر کاتبین وحی جو لکھ رہے ہیں)۔ تیسری راہ: گذشتہ قوموں کے احوال واقعات کے مطالعہ کی ترغیب کی راہ ہے تاکہ ان کے اچھے احوال سے فائدہ اٹھایا جاسکے، یعنی استفادہ کی خاطر عبرتیں، نصائح اور اسباق نکالے جائیں اور انجام کار سے عبرتیں حاصل کی جائیں۔ اس لئے کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''نحن نقص عليك أحسن القصص بما أوحينا إليك هذاالقرآن وإن كنت من قبله لمن الغافلين'' (سورۂ یوسف:۳) (ہم آپ کی طرف اس قرآن کی وحی کے ذریعہ آپ کے سامنے بہترین واقعات بیان کر رہے ہیں، اگرچہ آپ اس سے پہلے بے خبر تھے)، نیز اللہ رب العزت کا فرمان ہے: ''أولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده'' (سورۂ انعام:۹۰) (یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت فرمائی، سو آپ ان کی ہدایت کی پیروی کیجئے)، ایک دوسرے مقام پر فرمان باری تعالیٰ ہے: ''ونبين لكم كيف فعلنابهم'' (سورۂ ابراہیم:۴۵) (اور ہم تم لوگوں کے سامنے واضح کر رہے ہیں کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا)، دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۳۰، ص:۴۲۶-ان اسباق میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنی پیدائش سے اللہ اور اس کی بعض صفات پر ایمان رکھتا ہے، اس لئے کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''واتل عليهم نبأالذي آتيناه آياتنا فانسلخ منها فأتبعه الشيطان فكان من الغاوين، ولو شئنا لرفعناه بها ولكنه أخلد إلى الأرض واتبع هواه،فمثله كمثل الكلب إن تحمل عليه يلهث أو تتركه يلهث'' (سورۂ اعراف:۱۷۵-۱۷۶) (ان کو اس شخص کا واقعہ سنایئے جسے ہم نے اپنی نشانیوں سے نوازا، تو اس نے ان کا لبادہ اتار پھینکا، اور شیطان نے اسے اپنا پیروکار بنالیا، اور وہ گمراہ ہوگیا، اگر ہم چاہتے تو ان کے ذریعہ اسے بلند کردیتے، لیکن وہ زمین کی طرف جھک گیا (دنیاداری کی طرف مائل ہوگیا) اور اپنی خواہش کی پیروی کی۔ سو اس کی مثال کتے جیسی ہے، اگر تم اس پر حملہ کروگے تو وہ ہانپنے لگے گا، یا اسے چھوڑ دوگے پھر بھی وہ نیچے کی طرف اپنی زبان نکال کر ہانپے گا)۔ بہرحال ان کے ایمانی اعتقاد کا بگاڑ تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں غلطی، صفات کو معطل کرنے اور شریک ٹھہرانے کی وجہ سے طاری ہونے والا امر ہے، اس کی تفصیلات کا مطالعہ ابن عاشورؒ کی درج ذیل کتاب میں کیجئے: ابن عاشور، ''اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام'' مرجع سابق، ص: ۴۷-

مسدود کیا جائے۔

''تعلیل'' کا مطلب یہ ہے کہ خالق، کائنات، انفس اور مختلف آفاق کے سلسلے میں غور و فکر کرتے وقت عقل انسانی کو نظریاتی اور استدلالی قدرت کے استعمال پر متوجہ کیا جائے۔

اس طرح ''اصلاح عقائد'' ہر چیز سے پہلے اللہ تعالی کی وحدانیت اور رسولوں کی بعثت کے اثبات سے مربوط ہے، نیز اس بات سے مربوط ہے کہ رسول اللہ تعالی کے معزز بندے ہیں، وہ اور دیگر افراد اللہ سبحانہ کے حکم کے بغیر کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے ہیں، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**قل فمن يملك من الله شيئا إن أراد أن يهلك المسيح ابن مريم وأمه ومن في الأرض جميعا**''(سورۂ مائدہ:۱۷)(آپ کہہ دیجئے: اللہ کے مقابلہ میں کون کسی چیز کا اختیار رکھے گا، اگر وہ مسیح ابن مریم، ان کی والدہ اور زمین کے سارے باشندگان کو ہلاک کرنا چاہے)، نیز فرمان باری تعالی ہے:''**بل عباد مكرمون، لا يسبقونه بالقول وهم بأمره يعملون، يعلم ما بين أيديهم وما خلفهم ولا يشفعون إلا لمن ارتضى، وهم من خشيته مشفقون، ومن يقل منهم إني إله من دونه فذلك نجزيه جهنم كذلك نجزي الظالمين**''(سورۂ انبیاء:۲۶-۲۹)(بلکہ وہ اللہ سبحانہ کے معزز بندے ہیں، اس کے سامنے گفتگو میں پہل نہیں کر سکتے ہیں، وہ اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں، اللہ تعالی ان کے آگے پیچھے کی باتیں جانتا ہے، وہ اسی کی سفارش کریں گے، جس کے لئے اللہ پسند فرمائے گا، وہ اس کے خشیت وخوف سے لرزاں وترساں رہتے ہیں، ان میں سے جو کہے گا کہ اللہ کو چھوڑ کر میں خدا ہوں، اسے ہم جہنم کی سزا دیں گے، ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں)۔ اس طرح ایمان اپنے مختلف ارکان کے ساتھ متعدد دینی اور اخروی مصالح پر مشتمل ہے، چنانچہ ایمان افضل ترین اعمال ہے، اس لئے کہ اس سے بہترین مصالح کی تحصیل ہوتی ہے اور قبیح ترین مفاسد کا ازالہ ہوتا ہے، نیز وہ بذات خود شرف وعظمت والا ہے اور اس سے وابستہ امور بھی شرف وعظمت والے ہیں''(۱)۔

۱- ابن عبد السلام، عز الدین عبد العزیز، ''قواعد الأحكام في مصالح الأنام''، ضبط ومراجعت: طہ عبد الرؤوف سعد، بیروت: دار الجیل، ط:۲، (۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء)، ج۱، ص:۵۴۔

اس باب کے اندر ہم متعدد مصالح کو بیان کریں گے۔

ایک مصلحت یہ ہے کہ روز آخرت یا جزا کے دن پر ایمان سے یہ مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالی کو اس بات سے منزہ قرار دیا جائے کہ وہ اپنے اعمال اور احکام کو عبث و بے فائدہ انجام دیتا ہے، اس کی وضاحت یوں ہے کہ کوئی انسان بعث (دوبارہ زندہ کئے جانے) اور جزا کا انکار کرے، اس سے لازم آتا ہے کہ وہ تخلیق کے سلسلہ میں عدل الٰہی اور ربانی حکمت کا منکر ہے، بلکہ اس کفر وانکار کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان خود کو حقیر سمجھے، اس لئے کہ بہ قول شیخ محمد رشید رضاؒ وہ اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ: ''وہ بے فائدہ پیدا کیا گیا ہے، کسی مؤثر حکمت و مصلحت کی خاطر پیدا نہیں کیا گیا ہے، نیز اس روئے زمین پر اس کا وجود وقتی ہے اور اسی چھوٹی عمر کے ساتھ محدود ہے، جو ہم وغم، مصائب وآفات، ظلم وجور، سرکشی اور گناہ کی وجہ سے مکدر ہے، اور اسے یوں ہی بے فائدہ چھوڑ دیا جائے گا، ظالم افراد کو اس کے ظلم کا بدلہ نہیں ملے گا، اور ہر عادل اور باکمال کو اس کے عدل وکمال کا بدلہ نہیں دیا جائے گا''(۱)۔

دوسری مصلحت یہ ہے کہ اس دین کا تحفظ کیا جائے، جس سے دنیوی مصالح درست ہوں، جیسا کہ امام شاطبیؒ اور امام ابن عاشورؒ نے بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ یہ مصلحت اسی وقت وجود پذیر ہوگی جبکہ عام مسلمانوں اور امت کے عام افراد کا تحفظ ان ساری چیزوں سے کیا جائے جو ان کے اعتقاد کو بگاڑے اور ان کے اصول عقیدہ کو برباد کرے، جیسے: بدعات وخرافات، شرک والحاد اور زندقہ وغیرہ کی مختلف قسمیں۔

تیسری مصلحت یہ ہے کہ اعمال کا تحفظ کیا جائے کہ وہ بے حیثیت و بے فائدہ نہ ہوں، اس لئے کہ فرمان باری تعالی ہے: ''**وقدمنا إلى ما عملوا من عمل فجعلناه هباء منثورا**''(سورۂ فرقان: ۲۳) (اور ہم ان کے کرتوتوں کی طرف رخ کر کے ان کو ذروں کی طرح بکھیر دیں گے (کوئی عمل باقی نہیں رہے گا، بس سزا ہی سزا ہوگی)۔

۱- رضا، محمد رشید، ''الوحی المحمدی''، بیروت: المکتب الاسلامی، ط: ۱۰، (۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)، ص: ۱۷۸۔

نیز ایک دوسرے مقام پر اللہ عزوجل کا فرمان ہے:"**وما منعهم أن تقبل منهم نفقٰتهم إلا أنهم كفروا بالله وبرسوله**" (سورۂ توبہ:۵۴)(ان کے صدقات قبول کرنے سے جو چیز مانع ہے وہ یہ کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں)، ایک تیسرے مقام پر اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:"**ومن يرتدد منكم عن دينه فيمت وهو كافر فأولئك حبطت أعمالهم في الدنيا والآخرة**"(سورۂ بقرہ:۲۱۷)(اور تم میں جو بھی دین سے ہٹے گا اور کفر وانکار کی حالت میں مرے گا، تو دنیا وآخرت میں ایسے لوگوں کے اعمال اکارت ہوجائیں گے)۔

مبحث سوم

اعتقادی تصور

یقیناً اعتقاد کی صلاح ودرستگی ایمان کے ارکان سمیت اس اعتقادی تصور کی وضاحت کے ساتھ مربوط ہے، جس کی تشکیل ایک انسان کو ایک طرف اپنے نفس اور زندگی کے بارے میں کرنی چاہئے تو دوسری طرف، کائنات اور اسکی چیزوں کے سلسلے میں کرنی چاہئے، قرآن کریم نے واضح طور پر ان مراحل کو بیان کیا ہے جن سے انسان کی تخلیق گزری ہے۔ اس حیثیت سے کہ انسان زمین میں اللہ تعالی کا خلیفہ ہے اللہ عزوجل نے اسے متعدد ان خصوصیات سے نوازا ہے جو اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں، قرآن پاک میں تین مراحل کی صراحت کی گئی ہے:

۱- پہلا مرحلہ مٹی اور روح سے انسان کی تخلیق ہے، جس میں اللہ سبحانہ کی طرف سے روح پھونکی جاتی ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی میں مذکور ہے: "**إني خلق بشرا من طين، فإذا سويته ونفخت فيه من روحي**" (سورۂ ص:۷۱-۷۲) (اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں مٹی سے ایک انسان بنانے والا ہوں، تو جب میں اسے بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجانا)۔

۲- دوسرا مرحلہ: نسل اور ذریت واولاد کی تخلیق کا ہے جو آدم اور حواء کے باہمی ملاپ سے ہوئی۔ جیسا کہ اس فرمان باری تعالی میں بیان کیا گیا ہے: "**يأيها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم من نفس واحدة، وخلق منها زوجها وبث منها رجالا كثيرا ونساء**" (سورۂ نساء:۱) (اے لوگو! اپنے اس مالک وخالق کا لحاظ رکھو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، اور

اس سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں (کے ملاپ) سے بہت سے مرد وعورت (دنیا بھر میں) پھیلا دیئے)۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: "**يأيها الناس إنا خلقناكم من ذكر وأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أكرمكم عند الله أتقاكم**" (سورۂ حجرات: ۱۳) (اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو قوموں اور قبیلوں وخاندانوں میں تقسیم کیا، تاکہ تمہارے درمیان تعارف ہو، تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقوی شعار ہے)۔

۳- تیسرا مرحلہ: ذریت واولاد کے تسلسل کا ہے، جو شادی کے بعد میاں بیوی کے نطفہ کے اختلاط وملاپ سے وجود میں آتی ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی میں مذکور ہے: "**ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهين**" (سورۂ سجدہ: ۸) (پھر اس نے حقیر نطفہ کے خلاصہ سے اس کی نسل پیدا کی)۔

دوسرے مقام پر فرمان الٰہی ہے: "**ألم نخلقكم من ماء مهين فجعلناه في قرار مكين إلى قدر معلوم**" (سورۂ مرسلات: ۲۰-۲۲) (کیا ہم نے تم کو حقیر مادہ سے نہیں پیدا کیا؟ پھر اس کو ایک متعین مدت تک کے لئے ایک جمی جمائی ٹھہرنے کی (محفوظ) جگہ پر رکھا)۔

انسان کا انجام خواہ اس کی عمر کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، وہ موت ہے جس کے ذریعہ وہ حساب وجزا کی خاطر اپنے ارتکاب کردہ اعمال کے ساتھ اخروی زندگی کی طرف منتقل ہوتا ہے، اس لئے کہ فرمان باری تعالی ہے: "**كل نفس ذائقة الموت وإنما توفون أجوركم يوم القيامة فمن زحزح عن النار وأدخل الجنة فقد فاز**" (سورۂ آل عمران: ۱۸۵) (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور تمہیں قیامت کے دن تمہارا مکمل اجر دے دیا جائے گا، پس جو جہنم سے دور کر دیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا وہ کامیاب رہا)۔

یقیناً انسان زمین کے اندر اللہ سبحانہ کا خلیفہ ہے، اس لئے کہ فرمان باری تعالی

ہے:''وإذ قال ربک للملائکة إني جاعل في الأرض خلیفة''(سورۂ بقرہ:۳۰)(اس وقت کو یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں خلیفہ مقرر کروں گا)۔یعنی اللہ تعالی نے انسان کو اپنی عبادت کی ذمہ داری سپرد کی ہے، اور اسے اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ خلیفہ بنائے گئے سارے امور میں امین و ذمہ دار ہے، اس باب میں قرآنی آیات بہت ہیں، ان میں سے ایک آیت ہے:''وما خلقت الجن والإنس إلا لیعبدون''(سورۂ ذاریات: ۵۶)(میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں)، ایک دوسری آیت ہے:''إنا عرضنا الأمانة علی السماوات والأرض والجبال فأبین أن یحملنها وأشفقن منها وحملها الإنسان''(سورۂ احزاب:۷۲)(یقیناً ہم نے آسمان وزمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی تو انہوں نے بار امانت اٹھانے سے انکار کر دیا، اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھالیا)۔

ایک تیسرے مقام پر ہے:''وأنفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه''(سورۂ حدید:۷)(اور اس مال میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمہیں جانشیں ونائب بنایا ہے)، ایک چوتھے مقام پر فرمان باری تعالی ہے:''ثم جعلناکم خلائف في الأرض من بعدهم لننظر کیف تعملون''(سورۂ یونس:۱۴)(پھر ہم نے تمہیں زمین میں ان کے بعد خلیفہ بنایا، تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو)(۱)۔ایک پانچویں مقام پر اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وهوالذي جعلکم خلائف الأرض ورفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم في مآء أتاکم''(سورۂ انعام:۱۶۵)(اور اسی نے تمہیں زمین میں جانشیں ونائب بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض پر کئی درجے فوقیت دی، تاکہ تمہیں اس مال کے سلسلہ میں آزمائے جو اس نے تمہیں دیا ہے)۔انسان اس ذمہ داری کو انجام دینے پر قادر ہو جائے اس

۱- ان آیات سے ثابت ہونے والے احکام کی وسیع واقفیت کے لئے دیکھئے: قطب، سید، ''خصائص التصور الإسلامی ومقوماتہ''، قاہرہ، دار الشروق، (۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء)، ص: ۴۳، اور ۹۱- حامدی عبدالکریم، ''مقاصد القرآن من تشریع الأحکام''، بیروت، دار ابن حزم، ط:۱، (۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء)، ص: ۸۴ اور اس کے بعد کے صفحات۔

مقصد سے اللہ تعالی نے اسے متعدد خصوصیات سے نوازا ہے، جن میں نمایاں تر خصوصیت اعزاز ہے، اس لئے کہ ارشاد الٰہی ہے:"**ولقد كرمنا بني آدم وحملناهم في البر والبحر ورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا**"(سورۂ اسراء:۷۰) (اور ہم نے اولاد آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سفر کے ذرائع عطا کئے، اور انہیں پاکیزہ چیزوں میں سے روزی دی اور ان کو اپنی پیدا کردہ بہت سی مخلوقات پر فضیلت و برتری سے سرفراز کیا)(۱)۔

ایک دوسری نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندہ مخلوق ہے، اس پر کسی دوسری مخلوق کو اقتدار حاصل نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:"**لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي**"(سورۂ بقرہ:۲۵۶) (دین کے معاملہ میں کوئی اکراہ و جبر نہیں ہے، ہدایت، ضلالت و گمراہی سے ممتاز و جدا ہو چکی ہے)۔

انسان وہ مخلوق ہے جس کے لئے اللہ تعالی نے کائنات اور اس میں موجود آسمانوں اور زمین وغیرہ دیگر مخلوقات کو مسخر کر رکھا ہے، ان ساری مخلوقات کو اللہ تعالی نے برحق طریقہ پر انسان کے لئے مسخر کر رکھا ہے(۲)، فرمان باری تعالی ہے:"**وما خلقنا السموات والأرض وما بينهما إلابالحق**"(سورۂ حجر:۸۵) (ہم نے آسمان و زمین ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ان کو برحق پیدا کیا ہے)۔ اور حق کے کئی مظاہر ہیں:

۱- اس نکتہ کی وسیع معلومات کے لئے دیکھئے: فاسی، علال، "مقاصد الشریعۃ الإسلامیۃ ومکارمہا"، دراسہ وتحقیق: اسماعیل حسنی، قاہرہ: دارالسلام، ط:۱، (۱۴۳۲ھ/۲۰۱۱ء)، ص:۳۴۰۔

۲- اللہ تعالی کائنات کا خالق و موجد ہے، اس لئے کہ ارشاد الٰہی ہے:"**الله يبدؤالخلق ثم يعيده ثم إليه ترجعون**"(سورۂ روم:۱۱) (اللہ ہی پہلی مرتبہ تخلیق فرماتا ہے، پھر وہی اسے دوبارہ پیدا فرمائے گا، پھر تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے)، نیز فرمان باری تعالی ہے:"**إن ربكم الله الذي خلق السموات والأرض في ستة أيام**"(سورۂ اعراف:۵۴) (یقیناً تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا)، قرآن کریم نے ماہر اہل علم کے لئے کائنات کی تخلیق کی تاریخ کی وضاحت اور اس کے احوال و مظاہر کے درمیان موجود تعلقات کی تشریح کرنے والے قوانین کے انضباط و تعین کے سلسلہ میں غور و فکر کو چھوڑ دیا ہے۔

۱-ایک مظہر یہ ہے کہ اللہ تعالی کی مسخر کردہ چیزوں اورعطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے، اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**ولقد مكناكم فى الأرض وجعلنالكم فيها معايش قليلا ما تشكرون**"(سورۂ اعراف:۱۰)(اورہم نے تمہیں زمین میں اقتدار بخشا،اورتمہارے لئے اس کے اندر معیشت کے سازوسامان رکھے،تم بہت کم شکرادا کرتے ہو)۔

۲-دوسرامظہر یہ ہے کہ کائنات کے بارے میں غور وفکر اللہ تعالی کی ہدایت ومعرفت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہو، اس لئے کہ اللہ عز وجل کا ارشاد ہے:"**إن فى خلق السموات والأرض واختلاف الليل والنهار لآيات لأولى الألباب، الذين يذكرون الله قياما وقعودا وعلى جنوبهم ويتفكرون فى خلق السموات والأرض ربنا ما خلقت هذاباطلا سبحانک**"(سورۂ آل عمران:۱۹۰-۱۹۱)(یقیناً آسمان و زمین کی تخلیق اوررات ودن کی گردش کے اندر عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جوکھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں،اورآسمان وزمین کی تخلیق کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں، اور بول اٹھتے ہیں:اے ہمارے رب تو نے اسے بے فائدہ پیدانہیں کیا، تیری ذات پاک ہے)۔

۳-تیسرا مظہر یہ ہے کہ کائنات انسان اور اس کی ہدایت ورہنمائی کے لئے مسخر رہے،اس لئے کہ فرمان باری تعالی ہے:"**وسخرلكم الشمس والقمر دآئبين وسخرلكم الليل والنهار و أ تاكم من كل ما سألتموه**"(سورۂ ابراہیم:۳۳-۳۴)(اور اسی نے تمہارے لئے سورج وچاندکومسلسل مسخر کررکھا ہے،اوراسی نے تمہارے لئے رات ودن کو مسخر کیا ہے،اورتمہیں تمہاری مانگی ہوئی چیزوں میں سے ہر چیز سے نوازا ہے)، نیز ارشادالٰہی ہے:"**وهو الذي سخر البحرلتأكلومنه لحما طرياوتستخرجوا منه حلية تلبسونها**"(سورۂ نحل:۱۴)(اوراسی نے تمہارے لئے سمندرکومسخر کررکھا ہے،تاکہ تم اس سے تازہ

گوشت کھاؤ، یعنی مچھلی کھاؤ، اور اس سے اپنے پہننے کے لئے زیورات نکالو)، ایک دوسرے مقام پر اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**وسخرلكم ما في السموات وما في الأرض جميعا منه**'' (سورۂ جاثیہ: ۱۳) (اور اسی نے تمہارے لئے ان ساری چیزوں کو مسخر کر رکھا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں، سب اسی کی طرف سے ہے)۔

استاذ صالح سلیمان رقم طراز ہیں: ''ایک صالح انسان اللہ تعالی کی طرف سے مسخر کردہ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے تئیں کائناتی احوال کو اخذ کر کے ان اسباب میں غور وفکر کرتا ہے جو ان پر کنٹرول کرتے ہیں، اور اس کے اس یقین میں اضافہ ہوجاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق کی پائداری واستحکام اسلام کے اندر ایک خالص اور اصلی اصول ہے، اور یہ اس میں ارتقا اور تبدیلی کا نتیجہ نہیں ہے، اسی طرح اسے اس بات کا بھی احساس ہوجاتا ہے کہ یہ کائنات اسی کی مانند مخلوق ہے اور اللہ سبحانہ وتعالی کی پرستش میں لگی ہوئی ہے، اپنی خوشی واختیار سے اللہ عزوجل کی تسبیح وتنزیہ کرتی ہے، اس طرح یہ انسان کائنات کی تخلیق کی عظمت اور اس کے وجود کی حکمت ومصلحت کا احساس کر کے اللہ تعالی کی پاکی وتسبیح کے نغمے گنگنانے لگتا ہے، ''**ربنا ما خلقت هذاباطلا سبحانك**'' (سورۂ آل عمران: ۱۹۱) (اے ہمارے پروردگار! تو نے اس کائنات کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا، تیری ذات پاک ہے)، اسی طرح وہ یہ بھی ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالی تخلیق کے اندر جو چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے، ''**الحمدلله فاطر السموات والأرض جاعل الملائكة رسلا أولى أجنحة مثنى وثلاث وربع يزيد في الخلق ما يشاء إن الله على كل شيء قدير**'' (سورۂ فاطر: ۱) (تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو آسمان وزمین کا خالق ہے، اس نے فرشتوں کو رسول وپیامبر بنایا، جو دو، تین تین اور چار چار بازو والے ہیں، وہ جو چاہتا ہے تخلیق میں اضافہ فرماتا ہے، یقیناً اللہ تعالی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)(۱)۔

۱- ماخوذ از: غامدی، علی خمیس، ''الإنسان الصالح وتربیتہ من منظور إسلامی''، مکہ مکرمہ، دار طیبہ خضراء، ط: ۱، (۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ء)، ص: ۱۵۰۔

اعتقادی مظہر کے اس قرآنی اہتمام کے مدنظر امام مالکؒ کی طرف منسوب اس مشہور مقولہ کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں، جس میں آپؒ نے فرمایا تھا: ''اس امت کے اخیر کے لوگوں کی وہی چیز اصلاح کرے گی، جو امت کے پہلے لوگوں کی اصلاح کر چکی ہے''(۱)۔

سب سے نمایاں ترین امر جس کے ذریعہ امت کے اگلے لوگوں کی اصلاح ہوئی وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں وارد عقیدہ وحدانیت دو عظیم مصلحت کے لئے ہے:

پہلی مصلحت عقلی مصلحت ہے جس کی نمایاں صورت وہ ذہنی استدلال ہے جو ہر اس چیز پر مبنی ہے جس کی دلیل سے تائید ہو، اس سے انسان صرف یہ نہیں سیکھتا ہے کہ کیسے متاثر ہو، کیسے مظاہرہ کرے، کیسے استدلال کرے، اور کیسے مسترد کرے..... وہ اس سے یہ بھی سیکھتا ہے کہ کیسے سوچے، کیسے باہم بات چیت کرے، کیسے باہم رابطہ کرے، اور کیسے محنت کاوش کرے، فرمان باری تعالی ہے: **''قل إنما أعظكم بواحدة أن تقوموا لله مثنى وفرادى ثم تتفكروا''** (سورۂ سبا:۴۶) (آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ کہ تم اللہ کے لئے ایک ایک اور دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ، پھر غور کرو)۔

دوسری مصلحت: یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کی بندگی سے آزاد ہو جائے، اس لئے کہ قرآن کریم کسی فرد میں تقدس کی کسی قسم کی نفی کرتا ہے، خواہ وہ نبی یا رسول ہی کیوں کر نہ ہو، فرمان باری تعالی ہے: **''قل يأهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألانعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا''** (سورۂ آل عمران:۶۴) (آپ کہہ دیجئے: اے اہل کتاب ایک

۱- منقول ہے کہ مدینہ کے کچھ لوگ سفر سے اپنی آمد کے وقت یا جمعہ کے روز رسول اکرم ﷺ کی قبر کے پاس کھڑے ہوتے، سلام کرتے اور تھوڑی دیر دعا کرتے۔ امام مالکؒ سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا: ''ہمارے اس شہر کے فقہاء میں سے کسی سے مجھے یہ بات معلوم نہیں ہوئی، اس کو ترک کرنا چاہئے، اس امت کے اخیر میں لوگوں کی اصلاح اسی چیز سے ہوگی جس سے پہلے لوگوں کی اصلاح ہوئی ہے، اور اس امت کے پہلے لوگوں اور سلف صالح سے مجھے یہ اطلاع نہیں پہنچی ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے، اور ایسا کرنا مکروہ ہے، مگر اس شخص کے لئے جائز ہے جو سفر سے آئے، یا سفر کا قصد کرے، دیکھئے: قاضی عیاض، ابو الفضل عیاض بن موسی یحصبی، ''الشفا بتعریف حقوق المصطفی ﷺ، تحقیق: علی محمد بجاوی، بیروت، دار الکتاب العربی، (۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء)، ج ۲، ص:۶۷۶۔

درست بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر مسلم ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں)۔

نیز اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''**ليس لك من الأمر شيء أويتوب عليهم أويعذبهم فإنهم ظالمون**'' (سورۂ آل عمران:۱۲۸) (آپ کو کوئی اختیار نہیں ہے، یا اللہ ان کو توبہ کی توفیق دے، یا انہیں عذاب دے؛ کیونکہ وہ ظالم ہیں)۔

یقیناً ان دونوں عقلی اور غیر اللہ کی بندگی سے آزادی کی مصلحت کے تقاضے کی تربیت کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اعتقاد کی مسلسل اصلاح ہو، اس لئے کہ اس تربیت سے عقل انسانی توہمات میں مبتلا ہونے اور ضلالتوں اور گمراہیوں کا ارتکاب کرنے سے منزہ و پاک ہوجائے گی۔ اس طرح انسان اس آزاد ذہنیت کے مدنظر خلافت اور احکام وشرائع کی پابندی کی ذمہ داری سنبھالنے کے لائق ہوجائے گا، ورنہ پست سے پست درجہ ''**اسفل سافلين**'' (سورۂ تین:۵) میں پہنچ جائے گا(۱)۔

آزاد ذہنیت کا حامل انسان پستی میں مبتلا لوگوں کے جال میں نہ پھنسے، اس مقصد کے لئے لوگوں کے درمیان ''تدافع'' ضروری ہے، اس لئے کہ ''تدافع'' ہی ایسا ذریعہ ہے جس سے زمین کی صلاح ودرستگی ہوتی ہے، اور اس کے بغیر فساد پھیلتا ہے، فرمان باری تعالی ہے: ''**ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض**'' (سورۂ بقرہ:۲۵۱) (اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ ایک کو دوسرے سے ٹکرا دیتا ہے (اگر معرکہ حق و باطل قائم نہ ہو) تو زمین میں فساد پھیل جاتا)۔

۱- ایک معبود پر ایمان کے بغیر انسان پست سے پست درجہ میں پہنچ جاتا ہے، اور امام ابن عاشورؒ کے بقول اس شخص سے گھٹیا کون ہوسکتا ہے جو: ''پتھر، گونگے جانور جیسے: گائے، مگرمچھ، ازدہا اور ببول کے درخت کو معبود سمجھ بیٹھے، یا جو زمانہ کو معبود گمان کر بیٹھے اور اسے ''دہر'' سے موسوم کرے، یا جو خالق کے معبود ہونے کا انکار کر بیٹھے، حالانکہ وہ اس کی مصنوعات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اسے خود اپنے وجود کا احساس ہے''، دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۳۰، ص:۴۲۶۔

فصل سوم

اصلاح فکر کا مظہر

قرآن مجید میں وارد اصلاح کے مفہوم کو تشکیل کرنے والے اس مظہر کو اجاگر کرنے کی خاطر اس سیاق میں ''صلاح'' اور ''فساد'' کے مادہ کی چھان بین اور استقراء سے ہمیں بہت زیادہ مدد نہیں ملتی ہے، اس لئے اگر ہم اس استقراء پر اکتفا کریں گے تو اس اصلاح کی نوعیت معلوم کرنے پر قادر نہیں ہوں گے، جسے قرآن کریم فکر انسانی کے سلسلہ میں مستحکم طور پر پیش کرتا ہے۔ لہذا اصلاح اعتقاد کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی فکری اصلاح کو سمجھنے کی خاطر اس استقراء کے حدود کا پتہ لگانا، بلکہ اس سے تجاوز کرنا بہت ضروری ہے۔

مبحث اول
فکری صلاح ودرستگی کے عقلی اصول

فکری صلاح ودرستگی کا معیار غور وفکر، ذاتی محاسبہ، تحقیق، موضوعیت اور حجت ودلیل وغیرہ اصولوں پر قائم ہے، جن اصولوں کو اس دائرہ میں داخل کیا جاسکتا ہے(۱)۔

الف-منظّم کرنے والے سنن وقوانین کو حاصل کرنے کی خاطر مختلف انفس وآفاق میں غور وفکر کا اصول-متعدد آیتیں اس اصول پر دلالت کرتی ہیں۔ایک آیت میں ارشاد باری تعالی ہے:''**وفی أنفسکم أفلا تبصرون**''(سورۂ ذاریات:۲۱)(خود تمہاری ذاتوں میں بھی (قدرت الٰہی) کی نشانیاں ہیں، کیا تم غور نہیں کرتے)۔ایک دوسری آیت میں فرمان باری تعالی ہے:''**فلینظر الإنسان مم خلق**''(سورۂ طارق:۵)(انسان کو غور کرنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے)، ایک تیسری آیت میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**أفلا ینظرون إلی الإبل کیف خلقت، وإلی السماء کیف رفعت، وإلی الجبال کیف نصبت، وإلی**

۱- ان اصولوں میں سے ایک مصالح اور مفاسد کے درمیان موازنہ کرنا ہے، دوسرا اصول انجام کار کی واقفیت ہے، جس پر تحریم خمر کی آیتیں مشتمل ہیں، بالخصوص درج ذیل آیتیں مشتمل ہیں:''**یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیهما إثم کبیر ومنافع للناس وإثمهما أکبر من نفعهما**''(سورۂ بقرہ:۲۱۹)(یہ لوگ آپ سے شراب اور جوا کے بارے میں دریافت کررہے ہیں، آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منفعت بھی ہے، اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے)، نیز ارشاد الٰہی ہے:''**إنما یریدالشیطان أن یوقع بینکم العداوة والبغضاء في الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر الله وعن الصلوة فهل أنتم منتهون**''(سورۂ مائدہ:۹۱)(شیطان شراب اور جوا میں پھنسا کر تمہارے درمیان دشمنی اور نفرت ڈال دینا چاہتا ہے، تو کیا تم باز آجاؤگے؟۔

الأرض كيف سطحت''(سورۂ غاشیہ:۱۷-۲۰)(کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کئے گئے ہیں اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح بلند کیا گیا ہے، اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں، اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح ہموار کی گئی ہے)۔

ایک چوتھی آیت میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**فهل ينظرون إلا سنت الأولين فلن تجد لسنت الله تبديلا، ولن تجد لسنت الله تحويلا**''(سورۂ فاطر:۴۳)(سو کیا وہ اگلے لوگوں کے طریقہ کے منتظر ہیں، تو آپ سنت اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے، اور نہ ہی اللہ کے قانون میں کوئی تغیر پائیں گے)۔

ب- ذاتی محاسبہ کا اصول، یا وہ اصول جسے استاذ علال فاسیؒ نے'' ذاتی تنقید'' سے موسوم کیا ہے۔ یہ ارشاد الٰہی سے ماخوذ اصول ہے:''**أولما أصابتكم مصيبة قد أصبتم مثليها قلتم أنى هذا قل هو من عندأنفسكم إن الله على كل شيء قدير**''(سورۂ آل عمران:۱۶۵)(کیا جب تمہیں مصیبت لاحق ہوئی، حالانکہ تم بھی اس سے دو چند مصیبت پہنچا چکے ہو، تو تم بول پڑے: یہ مصیبت کہاں سے آ پڑی؟ آپ کہہ دیجئے: یہ خود تمہاری طرف سے ہے، یقیناً اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے)، نیز اس ارشاد الٰہی سے ماخوذ ہے:''**وما أصابكم من مصيبة فيما كسبت أيديكم ويعفوا عن كثير**''(سورۂ شوری:۳۰)(اور تمہیں جو مصیبت لاحق ہوتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے ہے، اور وہ بہت سی حرکتوں کو معاف فرما دیتا ہے)۔

اس اصول سے متصف ہونے کے نتیجہ میں سب سے پہلے یہ میلان پیدا ہوتا ہے کہ ان ذاتی اسباب کو اجاگر کیا جائے جو کوتاہی، کمی اور آفات ومصائب کی تشریح کریں۔ اور تنقید کرنے والا پہلے ہی وہلہ میں مختلف قسم کی ناکامیوں اور غلطیوں کے ارتکاب کی ذمہ داری دوسروں کے سر ڈالنے میں جلدی نہ کرے۔ چنانچہ آدم علی نبینا وعلیہ السلام اپنی بیوی کے ساتھ غلطی میں مبتلا ہوئے تو ان دونوں نے خود کو ذمہ دار قرار دیا، اور غلطی کی نسبت شیطان کے بہکانے کے باوجود

اس کی طرف نہیں کی، اس کے برعکس، ابلیس جب گمراہ ہوا تو اس نے صفائی کے طور پر گمراہ کرنے کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالی کی طرف کی، پہلا طریقہ نیک اور صالحین کا ہے، جبکہ دوسرا طریقہ مذموم شیطانی فکر پر مبنی ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**فدلهما بغرور فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سو أتهما وطفقايخصفان عليهما من ورق الجنة وناداهما ربهما الم أنهكما عن تلكما الشجرة وأقل لكما إن الشيطان لكما عدومبين،قالاربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين**''(سورۂ اعراف: ۲۲-۲۳)(سو شیطان نے ان دونوں کو دھوکہ میں ڈال دیا (اور انہوں نے ممنوعہ درخت سے کھالیا) جب انہوں نے (ممنوعہ) درخت سے چکھا تو ان کے ستر کھل گئے، اور وہ دونوں (مارے شرم کے) اپنے ستر کو جنت کے پتے سے ڈھانکنے لگے، ان کے رب نے ان دونوں کو آواز دی، کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے (کھانے سے) منع نہیں کیا تھا، اور تم سے نہیں کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ان دونوں نے (اعتراف تقصیر کرتے ہوئے) کہا: اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں بخش نہ دے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور خسارہ میں مبتلا ہونے والوں میں ہو جائیں گے)۔

ت- تحقیق اور تحقیق واحاطہ کے تقاضے کا اصول:

فرمان باری تعالی کی روشنی میں تحقیق کی پابندی بالکل عیاں ہے: ''**يأيها الذين آمنوا إن جاء كم فاسق بنبأ فتبينوا أن تصيبوا قوما بجهالة فتصبحوا على مافعلتم نادمين**''(سورۂ حجرات:٦)(اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے، تو اس کے بارے میں تحقیق کرلو، مبادا ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کو ناسمجھی میں تم مصیبت لاحق کردو، اور اپنے کئے پر پچھتاوے میں مبتلا ہو جاؤ)، نیز فرمان باری تعالی ہے: ''**إذ تلقونه بألسنتكم وتقولون بأفواهكم ما ليس لكم به علم وتحسبونه هينا وهو عند الله عظيم، ولولآ إذ سمعتموه قلتم ما يكون لنا أن نتكلم بهذا سبحانک هذا بهتان عظيم، يعظكم**

الله أن تعود والمثله أبدا إن كنتم مؤمنين''(سورۂ نور:۱۵-۱۷)(اس وقت کو یاد کرو جب تم اسے اچک رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات بک رہے تھے، جس کا تمہیں علم نہیں تھا، اور تم اسے معمولی سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی سنگین بات تھی۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے اس بات کو سنا، تمبول پڑتے کہ ہم اسے اپنی زبان پر نہیں لا سکتے، رب کریم تیری ذات پاک ہے، یہ تو سنگین بہتان وافترا پردازی ہے، اللہ تعالی تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ (اب) کبھی اس طرح کی حرکت کی طرف لوٹو، اگر تم ایمان رکھتے ہو)۔

یہ امر واضح ہے کہ لوگوں کی فکر کی قرآنی اصلاح کے سلسلہ میں اس اصول کا بڑا کردار ہے؛ کیونکہ کتاب اللہ کی چھان بین کرنے والا خود کو اس موڑ پر پاتا ہے کہ شریعت کی خبروں اور روایتوں کو منتقل کرنے کے سلسلہ میں تحقیق واحتیاط لازم ہے اور اس کی بڑی اہمیت ہے۔ بہرحال تحقیق جس وضاحت اور ہمہ گیر احاطہ کا تقاضا کرتی ہے، وہ فرمان الہی سے ماخوذ ہے:''**ولا تقف ما ليس لک به علم إن السمع والبصر والفؤاد كل أولئک كان عنه مسئولا**''(سورۂ اسراء:۳۶)(جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑو، یقیناً کان، آنکھ اور دل سب سے باز پرس ہوگی)۔ حسین بن فضلؒ سے پوچھا گیا: کیا قرآن کریم میں یہ بات موجود ہے کہ جو کسی چیز سے ناواقف ہوتا ہے وہ اس سے دشمنی کرنے لگتا ہے اور انکار کر بیٹھتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں، یہ بات دو مقامات پر مذکور ہے:''**بل كذبوا بما لم يحيطوا بعلمه**''(سورۂ یونس:۳۹)(بلکہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جس کا مکمل علم ان کو نہ تھا)، نیز ارشاد الہی ہے:''**وإذ لم يهتدوا به فسيقولون هذا إفک قديم**''(سورۂ احقاف:۱۱)(اور کیونکہ انہیں اس کی ہدایت نہیں ملی، اس لئے یہ کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے)۔

قرآن مجید اس پس منظر میں ظاہری علم، علم کے احاطہ اور ظاہری علم میں رسوخ وپختگی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی میں مذکور ہے:''**وعد الله لا يخلف الله وعده، ولكن أكثر الناس لا يعلمون، يعلمون ظاهرا من الحيوة الدنيا وهم**

عن الآخرة هم غافلون" (سورۂ روم:۶-۷) (یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے، لیکن اکثر لوگوں کو (حقیقت) کا علم نہیں، وہ دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو جانتے ہیں، حالانکہ وہ آخرت سے غافل ہیں)، علم کے احاطہ کا مطلب یہ ہے کہ موضوع کے عناصر کے منہجی قدرت حاصل ہو، اور اس کے مختلف اطراف کے درمیان تعلقات کا ہمہ گیر فہم ہو، جیسا کہ فرمان باری تعالی میں مذکور ہے:"**بل كذبوا بما لم يحيطوا بعلمه ولما يأتهم تأويله**" (سورۂ یونس:۳۹) (بات یہ ہے کہ جس کے علم کا یہ احاطہ نہیں کر سکے، اور جس کی حقیقت ان کے سامنے نہیں ہے، اس کی تکذیب کرنے لگے)۔

علم میں رسوخ وپختگی کا مطلب یہ ہے کہ آراء وحقائق کی تشکیل اور نظریہ سازی کی قدرت ہو، جیسا کہ اللہ رب العزت کے ارشاد میں مذکور ہے:"**وما يعلم تأويله إلا الله والراسخون في العلم يقولون آمنا به كل من عندربنا**" (سورۂ آل عمران:۷) (حالانکہ ان کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے (یعنی غیب کی باتیں اور اللہ کی ذات وصفات اور دیگر عالم بالا کے حقائق کی خبر اللہ ہی کو ہے) اور جو لوگ علم میں رسوخ وپختگی رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں، یہ سب حقائق ہمارے رب کی طرف سے ہیں)۔

ث-موضوعیت کا اصول:

یعنی خواہش نفس کو فیصل نہ بنایا جائے، اور معاملات کو اس کی طرف نہ لے جایا جائے، اس لئے کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**إن يتبعون إلا الظن، وإن الظن لا يغني من الحق شيئا**" (سورۂ نجم:۲۸) (وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ ظن حق کے مقابلہ میں کچھ مفید نہیں ہے)، اسی طرح ارشاد الہی ہے:"**بل اتبع الذين ظلموا أهواء هم بغير علم**" (سورۂ روم:۲۹) (بلکہ ظالم لوگ بغیر کسی علم کے اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں)، نیز فرمان باری تعالی ہے:"**فإن لم يستجيبوا لک فاعلم أنما يتبعون أهواء هم، ومن أضل من اتبع هواه بغير هدى من الله**" (سورۂ قصص:۵۰) (پھر اگر وہ آپ کی دعوت کو قبول نہ

کریں تو جان لیجئے کہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کررہے ہیں، اوراس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت ورہنمائی کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے)۔

ج- حجیت کا اصول:

جس کی بنیاد کسی دلیل کا سہارا لینے پر ہوتی ہے، اس کی دعوت دینے والی آیتیں متعدد اور بہت ہیں، ایک آیت میں ارشاد باری تعالی ہے:"**لوكان فيهما آلهة إلا الله لفسدتا**"(سورۂ انبیاء:۲۲)(اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو دونوں درہم برہم ہوجاتے)۔

ایک دوسری آیت میں ہے:"**ما اتخذ الله من ولدوما كان معه من إله إذا لذهب كل إله بما خلق ولعلا بعضهم على بعض**"(سورۂ مومنون:۹۱)(اللہ کی کوئی اولاد نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہوجاتا، اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا)۔

ایک تیسری آیت میں ہے:"**وضرب لنا مثلا ونسي خلقه قال من يحي العظام وهي رميم، قل يحييها الذي أنشأها أول مرة وهو بكل خلق عليم**"(سورۂ یس:۷۸-۷۹)(اوراس نے ہمارے لئے ایک مثال بیان کی اور اپنی تخلیق کو فراموش کر بیٹھا، اس نے کہا: ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، آپ کہہ دیجئے: انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ ان کو پیدا کیا ہے، اور اسے ہر تخلیق کا علم ہے)۔

مبحث دوم
فکری صلاح ودرستگی کے سلسلہ میں عقلی اصول ومبادی کا کردار

لوگوں کی قرآنی فکری اصلاح کے سلسلہ میں حجت ودلیل کے اصول کا اہم رول ہے، اس لئے کہ قرآن کریم نے بالخصوص عقائد کے باب میں تقلید سے منع فرمایا ہے، اور دلیل کو فیصلہ کن بنانے کی دعوت دی ہے، مشرکین وغیرہم پر حجت قائم کی ہے اور انسانیت کے سامنے ان کے عقائد کی تہہ میں موجود فاسد رائے اور دلائل اور آراء کے تضاد کو واضح کیا۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالی کے درج ذیل ارشاد کا استحضار کافی ہوگا: ''**قل هاتوا برهانكم إن كنتم صادقين**'' (سورۂ بقرہ:۱۱۱) (آپ کہہ دیجئے: تم اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو)، نیز ارشاد باری تعالی ہے: ''**قل هاتوا برهانكم هذا ذكر من معي وذكر من قبلي بل أكثرهم لا يعلمون الحق فهم معرضون**'' (سورۂ انبیاء:۲۴) (آپ کہہ دیجئے: تم اپنی دلیل پیش کرو، یہ ان کے لئے نصیحت نامہ ہے جو میرے ساتھ ہیں، اور ان کے بھی نصیحت نامہ میں جو مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں، بلکہ ان کی اکثریت حق کو نہیں جانتی ہے، سو وہ اعراض کئے ہوئے ہیں)۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**إن عندكم من سلطان بهذا أتقولون على الله مالاتعلمون**'' (سورۂ یونس:۶۸) (تمہارے پاس اس کی کوئی سند نہیں ہے، کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو جن کا علم نہیں)۔ ایک مقام پر فرمان باری تعالی ہے: ''**ومن أضل ممن اتبع هواه بغير هدى من الله**'' (سورۂ قصص:۵۰) (اور اس سے

بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش نفس کی پیروی کرے)، ایک جگہ ارشاد ہے: ''**ومن الناس من يجادل في الله بغير علم ولاهدى ولا كتاب منير**'' (سورۂ حج:۸) (لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو علم، ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارے میں بحث ومباحثہ کرتے ہیں)۔ ایک دوسرے مقام پر فرمان باری تعالی ہے: ''**والذين يدعون من دون الله لا يخلقون شيئا وهم يخلقون أموات غير أحياء**'' (سورۂ نحل:۲۰-۲۱) (جو اللہ تعالی کو چھوڑ کر دوسروں (بتوں وغیرہ) کو پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتے ہیں، جبکہ وہ خود پیدا کردہ ہیں، اور تخلیق کے محتاج ہیں، وہ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں)(۱)۔

شریعت کے باب میں دلیل پر اعتماد کرنے کے اصول کا دو تفصیلی امور کو پختہ اور مستحکم کرنے میں بڑا رول رہا ہے۔

۱- اس پس منظر میں قرآنی آیتیں بے شمار ہیں، جو حصر سے باہر ہیں، ایک جگہ فرمان باری تعالی ہے: ''**أفمن يهدي إلى الحق أحق أن يتبع أمن لا يهدي إلا أن يهدى فمالكم كيف تحكمون**'' (سورۂ یونس:۳۵) (کیا جو حق کی رہنمائی کرتا ہے زیادہ سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، یا اس کی پیروی کی جائے گی جو ہدایت کے بغیر راہ یاب نہ ہو، سو تمہیں کیا ہوا یہ کیسے فیصلے کر رہے ہو؟) ایک موقع پر ارشاد ہے: ''**اتعبدون ما تنحتون**'' (سورۂ صافات:۹۵) (کیا تم ان بتوں کی پرستش کرتے ہو جن کو تم خود تراشتے ہو)، ایک دوسری آیت میں فرمان باری تعالی ہے: ''**أفرأيت من اتخذ إلهه هوهه وأضله الله على علم وختم على سمعه وقلبه وجعل على بصره غشاوة فمن يهديه من بعد الله أفلا تذكرون**'' (سورۂ جاثیہ:۲۳) (بتاؤ جس شخص نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہو، اور علم کے باوجود اللہ نے اسے گمراہ کر دیا ہو، اور اس کے کان و دل پر مہر لگا دیئے ہوں، اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہو، تو اللہ کے بعد اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ہو؟)۔

ایک دوسری جگہ فرمان باری تعالی ہے: ''**إن في خلق السماوات والأرض واختلاف الليل والنهار لأيات لأولى الألباب، الذين يذكرون الله قياما وقعودو وعلى جنوبهم ويتفكرون في خلق السماوات والأرض ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار**'' (سورۂ آل عمران:۱۹۰-۱۹۱) (یقیناً آسمان وزمین کی تخلیق اور رات ودن کی گردش میں اہل عقل وخرد کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان وزمین کی تخلیق کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں، اور بول اٹھتے ہیں: اے ہمارے رب! تو نے اسے بے فائدہ پیدا نہیں کیا ہے، تیری ذات ہر نقص وعیب سے پاک ہے، سو ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے۔

پہلا امر یہ ہے کہ علمی تخصص ومہارت کے اصول کی رعایت کی جائے، اس لئے کہ ارشادالٰہی ہے:"**وأولی الأمر منکم**"(سورۂ نساء:۵۹)(اوراپنے سربراہان کار یعنی اہل علم کی بھی اطاعت کرو)، نیز فرمان باری تعالی ہے:"**فسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون**" (سورۂ انبیاء:۷)(اگر تم نہیں جانتے ہوتو اہل علم سے پوچھ لو)۔

دوسرا امر: تعلیل ہے، لیکن یہ عمل کرنے والے کے فائدے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس مفہوم میں ہے کہ علت کو حکم قرآنی کے اندر رکھا گیا ہے، جیسے: تعلیل کے ان لاموں کا حال ہے جو قرآنی احکام کے بیان کے بعد داخل ہوتے ہیں۔

یہ بات ہم فراموش نہیں کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید نے عبادات اور معاملات کے بہت سے احکام کو بہت سی تعلیلات کے ساتھ پیش کیا ہے، فرمان باری تعالی ہے:"**إنما يريد الشيطان أن يوقع بينكم العداوة والبغضاء في الخمر والميسر ويصدكم عن ذكر الله وعن الصلاة**"(سورۂ مائدہ:۹۱)(شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب وجوا میں پھنسا کر تمہارے درمیان دشمنی اور نفرت ڈال دے، اور تمہیں یادالٰہی اور نماز سے روک دے)۔

نیز فرمان باری تعالی ہے:"**ومن قتل مظلوماً فقدجعلنا لوليه سلطانا فلا يسرف في القتل إنه كان منصورا**"(سورۂ اسراء:۳۳)(اور جو ازراہ ظلم مارا جائے، اس کے سرپرست کو ہم نے حق دیا ہے (کہ وہ قصاص لے) لیکن قصاص لینے میں حد سے تجاوز نہ کرے، یقیناً اس کی مدد ہوگی)۔ ایک دوسرے مقام پر ارشادالٰہی ہے:"**ولكم في القصاص حياة يأولي الألباب**"(سورۂ بقرہ:۱۷۹)(اے عقلمندو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے یعنی قصاص زندگی کے تحفظ کا ذریعہ ہے)۔

اسی طرح قرآن مجید میں اکثر عبادتوں کی دنیوی اور مصلحت پر مبنی علتیں بیان کی گئی ہیں، جن سے انسان کو فائدہ ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:"**وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون، ماأريد منهم من رزق وما أريد أن يطعمون**"(سورۂ ذاریات:۵۶-۵۷)(میں

نے انس وجن کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے، میں ان سے روزی کا طلب گار نہیں ہوں، اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں)۔ایک دوسرے موقع سے ارشاد الٰہی ہے:"**لن ینال الله لحومها ولا دمآؤها ولكن يناله التقوى منكم**" (سورۂ حج:۳۷)(اللہ تعالی کو قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا ہے، لیکن اسے تمہارا تقوی اور دل کی پرہیز گاری پہنچتی ہے)۔

ایک دیگر مقام پر ارشاد ہے:"**وأن تصوموا خيرلكم**"(سورۂ بقرہ:۱۸۴)(اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے حق میں بہتر ہے)۔ایک جگہ ارشاد ہے:"**ليشهدوا منافع لهم**"(سورۂ حج:۲۸)(تاکہ وہ اپنے منافع کی جگہ حاضر رہیں)۔ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:"**إن الصلوٰة تنهى عن الفحشاء والمنكر**"(سورۂ عنکبوت:۴۵)(یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے)۔

یہ سب ایسے اصول ہیں جو ہماری فکر کو درست رکھتے ہیں، نیز یہ سب ایسے اصول ہیں جو اس بات میں حصہ لیتے ہیں کہ صحیح فکر کے ہم حامل رہیں(۱)۔یا اس چیز کے حامل بنیں جسے قرآن کریم نے''قلب سلیم'' سے موسوم کیا ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:"**يوم لا ينفع مال ولا بنون، إلا من أتى الله بقلب سليم**" (سورۂ شعراء:۸۸-۸۹)(جس دن مال واولاد کام نہیں آئے گی، مگر جو اللہ کے پاس قلب سلیم کے ساتھ پہنچے گا(تو اس کا قلب سلیم اس کے لئے نفع بخش ہوگا)۔نیز ارشاد الٰہی ہے:"**إذ جاء ربه بقلب سليم**"(سورۂ صافات:۸۴)(اس وقت کو یاد کرو جب وہ اپنے رب کے پاس قلب سلیم کے ساتھ پہنچے)،ایک دوسرے موقع پر اللہ عزوجل کا فرمان ہے:"**إن في ذلك لذكرى لمن كان له قلب أو ألقى السمع وهو شهيد**"(سورۂ ق:۳۷)(اس میں ہر اس شخص کے لئے سامان نصیحت ہے جس کے پاس قلب

۱- نیز یہ سب ایسے اصول ومبادی ہیں جو ہمیں اس قابل بناتے ہیں کہ ہم امام ابن عاشورؒ کی اس رائے کو سمجھ سکیں، جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے:''افراد کی اصلاح کے ذریعہ اجتماعی نظام قائم کرنے کے سلسلے میں اسلامی شریعت کا اہم ترین مقصد فکر کی اصلاح ہے''، دیکھئے: ابن عاشور،''أصول النظام الاجتماعی فی الإسلام''، مرجع سابق، ص:۵۲-۵۳۔

بیدار ہو، یا وہ حقائق کو دیکھتے ہوئے کان لگا کر بات سنے)۔ ایک جگہ ارشاد باری تعالی ہے: "**فإنها لا تعمى الأبصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور**" (سورۂ حج:۴۶) (حقیقت یہ ہے کہ آنکھوں کی بصارت زائل نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں)۔

زمخشریؒ تحریر فرماتے ہیں: ''اگر تم کہو کہ: سینوں کے ذکر میں کون سا فائدہ ہے؟ میں جواب میں کہوں گا کہ: جو بات معروف ہے اور جس پر لوگوں کا اعتقاد ہے وہ یہ ہے کہ حقیقت میں ''اندھے پن'' کی جگہ آنکھ ہے، یعنی آنکھ کے ڈھیلے اور گول حصہ کو کوئی ایسی آفت لاحق ہو جو اس کی روشنی کو زائل کردے۔ آنکھوں سے اندھے پن کی نفی کی تصویر کشی کے لئے مزید تعین اور وضاحت کی ضرورت ہوئی، تاکہ یہ بات ثابت ہوجائے کہ اندھے پن کی جگہ دل ہیں نہ کہ آنکھیں(۱)۔

درحقیقت اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ غور وفکر ان مقاصد میں سے ایک ہے، جن کی خاطر قرآن مجید کا نزول ہوا ہے اور انسان کے لئے وسیع وعریض کائنات کو مسخر کردیا گیا ہے۔ لہذا غور وفکر ان مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے جن کی خاطر نزول قرآن ہوا ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی میں اسے صراحتاً بیان کیا گیا ہے: ''**وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم ولعلهم يتفكرون**'' (سورۂ نحل:۴۴) (اور ہم نے تمہارے پاس یہ نصیحت نامہ بھیجا ہے کہ لوگوں کو واضح طور پر کھول کر بتادیجئے کہ ان کی طرف کیا اتارا گیا ہے، تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیں)۔ ایک دوسرے مقام پر اسے یوں اجاگر کیا گیا ہے: ''**إنا أنزلناه قرءانا عربيا لعلكم تعقلون**'' (سورۂ یوسف:۲) (ہم نے اس کتاب یعنی قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم عقل وخرد اور سمجھ بوجھ سے کام لو)۔ ''غور وفکر'' ان مقاصد میں سے بھی

۱- زمخشری، جاراللہ ابو القاسم محمود بن عمر، ''الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الأقاویل في وجوہ التأویل''، تحقیق: عادل احمد عبدالموجود وعلی محمد عوض، ریاض: مکتبہ العبیکان، ط:۱، (۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء)، ج ۳، ص ۱۶۴۔

ایک ہے جن کی خاطر کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔اس بات کی صراحت فرمان باری تعالی میں کی گئی ہے:"**إن في خلق السماوات والأرض واختلاف الليل والنهار لأيات لأولى الألباب، الذين يذكرون الله قياما وقعودا وعلى جنوبهم ويتفكرون في خلق السماوات والأرض** "(سورۂ آل عمران:۱۹۰-۱۹۱)(یقیناً آسمان وزمین کی تخلیق اور رات ودن کی گردش میں اہل عقل وخرد کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں،اور آسمان وزمین کی تخلیق کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں)،نیز فرمان باری تعالی ہے:"**كذلك يبين الله لكم الآيات لعلكم تتفكرون، في الدنيا والآخرة**"(سورۂ بقرہ:۲۱۹-۲۲۰)(اسی طرح اللہ تمہارے لئے آیتوں کو کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت کے سلسلے میں غور وفکر سے کام لو)۔

فکر کی صلاح ودرستگی کے مدنظر اللہ تعالی کا فضل ایک دوسرے پر ہوتا ہے،جیسا کہ اللہ عزوجل کے اس ارشاد میں مذکور ہے:"**قالوا أنى يكون له الملك علينا ونحن أحق بالملك منه ولم يؤت سعة من المال قال: إن الله اصطفاه عليكم وزاده بسطة في العلم والجسم**"(سورۂ بقرہ:۲۴۷)(وہ بولے ان کو ہم پر بادشاہت کیسے مل سکتی ہے؟ حالانکہ ان سے زیادہ بادشاہت کا استحقاق تو ہمارا ہے، اور ان کو مالی وسعت بھی حاصل نہیں، انہوں نے فرمایا:اللہ نے (تم پر ترجیح دیتے ہوئے) ان کا انتخاب فرمایا ہے، اور ان کو علم میں وسعت اور جسمانی قوت میں تم پر فوقیت دی ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جہالت اور جاہلیت میں مبتلا لوگوں پر تنقید کی ہے اور تقلید کرنے والوں کی مذمت کی ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:"**ويقوم لا أسئلكم عليه مالا إن أجري إلا على الله وما أنا بطارد الذين آمنوا إنهم ملقو ربهم ولكني أراكم قوماً تجهلون**"(سورۂ ہود:۲۹)(اور اے میری قوم کے لوگو! میں اس کار دعوت پر تم سے کسی قسم کا مالی مطالبہ نہیں کرتا ہوں،میری اجرت تو اللہ کے ذمہ ہے، اور میں اہل ایمان کو اپنے

پاس سے ہٹا تو سکتا نہیں، انہیں اپنے رب سے ملنا ہے، اور میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت اور نادانی کی باتیں کر رہے ہو)۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد الٰہی ہے:"**قل أفغير الله تأمرونی أعبدأيها الجاهلون**"(سورۂ زمر:۶۴)(آپ کہہ دیجئے:اے جاہلو! کیا تم مجھے یہ حکم دیتے ہو کہ میں اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی عبادت کروں)، نیز فرمان باری تعالی ہے:"**وإذا فعلوا فاحشة قالوا وجدنا عليها آباء نا والله أمرنا بها، قل إن الله لا يأمر بالفحشاء أتقولون على الله مالاتعلمون**"(سورۂ اعراف:۲۸)(اور جب وہ کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اس پر اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔آپ کہہ دیجئے: بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا ہے، کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے)۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس فکری اصلاح کی انجام دہی میں وہ دلیل ہے جس کے ذریعہ قرآن میں مسلمانوں کی طرف منسوب'' توسط واعتدال'' کو ہم مبرہن ومدلل اور ثابت کر رہے ہیں، اور جو ان کے افضل اور بہترین امت ہونے کا منبع اور ان کی شہادت اور رہبری کا سرچشمہ ہے۔جیسا کہ اللہ تعالی کے فرمان میں مذکور ہے:"**وكذلك جعلناكم أمة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا**"(سورۂ بقرہ:۱۴۳)(اس طرح ہم نے تم کو معتدل اور بہترین امت بنایا ہے تا کہ تم لوگوں کے حق میں گواہ بنو اور رسول تمہارے حق کے گواہ بنیں)۔

فصل چہارم
مظہر اصلاح عمل

اس جگہ عمل سے ہماری مراد: انسان سے صادر ہونے والے افعال واعمال ہیں، خواہ وہ نفسانی اعمال ہوں جو اس کے باطن سے صادر ہوئے ہوں، یا ایسے اعمال ہوں جو اس کے اعضاء وجوارح سے صادر ہوئے ہوں۔ چنانچہ انسانی عمل یا تو باطنی افعال ہیں جو نفسانی احساسات کی شکل اختیار کئے ہوئے ہیں، جو اس کے اعضاء وجوارح کے ارتکاب کردہ اعمال میں سے کسی عمل پر اس کے اقدام کی وضاحت کرتے ہیں (مثلاً: بھوک کے احساس کی وجہ سے کھاتا ہے، پیاس کے احساس کی وجہ سے پیتا ہے، غصہ کے احساس کی بنا پر انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے، وغیرہ)۔ یا خارجی اعمال ہیں، جن کو انسان کے اعضاء وجوارح اس مقصود کو حاصل کرنے کی خاطر جس پر فکر آمادہ کرتا ہے، انجام دیتے ہیں۔

مبحث اول
نفسانی عمل

قرآن مجید میں وارد اصلاح کے مفہوم کے نفسانی پہلو کو اجاگر کرنے کی خاطر ''صلاح'' اور ''فساد'' کے مادہ کا استقراء جس قدر اہم ہے، اسی قدر اس استقراء کے حدود کو واضح کرنا بھی لازم ہے، اس لئے کہ ان سے نفسانی عمل کی اصلاح کے قالب کے ایسے دیگر عملی مظاہر وجود میں آتے ہیں جو قرآن مجید میں وارد ''صلاح'' اور ''فساد'' کے مادہ کے مفردات والفاظ سے مربوط نہیں ہیں۔ یہ متعدد نفسانی اعمال کے اندر عیاں ہیں، جن میں ہم دو حصوں کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں:

پہلا حصہ:

تواضع، حلم و بردباری، محبت و مودت، قناعت، کرم و مہربانی، صدق و وفا اور عفو و درگذر وغیرہ جیسے ملتے جلتے اوصاف کے ساتھ مزین و آراستہ ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔

دوسرا حصہ:

تکبر و گھمنڈ، غضب و غصہ، کینہ و کپٹ، حسد و جلن، حرص و طمع، بخل و کنجوسی، ریاکاری و دکھاوا، غرور و خود پسندی اور کذب بیانی وغیرہ جیسی ملتی جلتی صفات سے باز رہنے پر آمادہ کرتا ہے۔

مثلاً: قرآن کریم نے کھانے پینے اور لباس و پوشاک اور نکاح کے سلسلے میں حد سے بڑھی ہوئی حرص و طمع سے منع کیا ہے، اور اس کے مخالف وصف یعنی اعتدال و توسط کا حکم دیا ہے،

جیسا کہ فرمان باری تعالی میں مذکور ہے: ''**وکلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لا یحب المسرفین**''(سورۂ اعراف:۳۱)(اور کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، یقیناً اللہ تعالی حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے)، نیز ارشاد باری تعالی ہے:''**ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحا حتی یغنیهم الله من فضله**''(سورۂ نور:۳۳)(اور ان کو جو نکاح کی قدرت نہیں رکھتے ہیں پاکدامنی اختیار کرنی چاہئے، یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے بے نیاز کردے)(۱)۔

قرآن مجید نے'' نفسانی اصلاح'' کا بڑا اہتمام کیا ہے، جس کی عملی شکل تزکیہ انسان ہے، اس حیثیت سے کہ تزکیہ بعثت ورسالت کے قرآن مجید کے پیش کردہ مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے، جس کی وضاحت رسول کریم محمد ﷺ کی سنت وسیرت سے ہوتی ہے۔ فرمان باری تعالی ہے:''**ربنا وابعث فیهم رسولا منهم یتلوا علیهم آیاتک وعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم**''(سورۂ بقرہ:۱۲۹)(اے ہمارے رب! ان میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایئے، جو ان کے سامنے تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ فرمائے)۔

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے:''**هو الذي بعث في الأمیین رسولا منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم**''(سورۂ جمعہ:۲)(وہی ہے جس نے'' امیین'' کے اندر ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ فرماتا ہے)۔ یقیناً تزکیہ ان نفوس کے لئے اصلاحی وتطہیری عمل ہے جو ضلالت وگمراہی یا تضلیلی کوشش اور گمراہ کرنے کی سعی سے پیدا ہونے والی گندگیوں سے آلودہ ہوتے رہتے ہیں، یہ اصلاحی

۱- اس پہلو کی وسیع معلومات کے لئے'' مکارم اخلاق'' کے تحت استاذ علال فاسیؒ کی تحریر کا مطالعہ کیجئے، جس میں انہوں نے'' مکارم اخلاق'' کو ہر عمومی مصلحت کا پیمانہ اور اسلام کے مقاصد میں سے ہر مقصد کی اساس قرار دیا ہے، فاسی،'' مقاصد الشریعة الإسلامیة ومکارمها''، مرجع سابق، ص:۳۰۱۔

وتطہیری عمل تخلیہ (رذائل اور بری خصلتوں سے خود کو پاک کرنے) اور تحلیہ (اچھے وعمدہ اوصاف سے خود کو آراستہ کرنے) کے ملاپ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ فرمان باری تعالی ہے: "**خذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها**" (سورۂ توبہ:۱۰۳) (آپ ان کے اموال میں سے صدقات لیجئے، ان کے ذریعہ آپ انہیں پاک کریں گے اور ان کا تزکیہ فرمائیں گے)۔

''تخلیہ'' کا مطلب ہے کہ رذائل اور برے اور گھٹیا کاموں سے دوری اختیار کی جائے۔ اور ''تحلیہ'' کا مطلب ہے کہ خوبیوں اور فضائل سے خود کو آراستہ کیا جائے۔ اسی اصلاحی وتطہیری عمل کے ذریعہ انسان شرائع واحکام کی پابندی اور خلافت کی امانت سنبھالنے پر قادر ہوجاتا ہے۔ راغب اصفہانیؒ کے بقول اللہ تعالی کی خلافت، اس کی عبادت وبندگی اور اس کی سرزمین کی آبادکاری کا وہی اہل ہوسکتا ہے جو پاک نفس اور پاک دل ہو، اور اس کی گندگی اور آلودگی دور کردی گئی ہو۔ چنانچہ جسم وبدن کی طرح نفس ودل بھی گندے اور ناپاک ہوتے ہیں۔ اللہ تعالی نے دونوں قسم کی طہارتوں اور پاکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: "**وثيابك فطهر، والرجز فاهجر**" (سورۂ مدثر:۴-۵) (اور اپنے کپڑے پاک رکھئے اور بتوں کی گندگیوں سے دور رہئے)۔ نیز ارشاد الہی ہے: "**إن الله يحب التوابين ويحب المتطهرين**" (سورۂ بقرہ:۲۲۲) (یقیناً اللہ تعالی توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے)(۱)۔

راغب اصفہانی مزید رقم طراز ہیں: ''چونکہ سیاست وتدبیر کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم یہ ہے کہ: انسان اپنے نفس، بدن اور ان سے متعلق امور ومعاملات کی تدبیر کرے، دوسری قسم یہ ہے کہ: دیگر افراد اور اپنے اہل شہر کے امور ومعاملات کی تدبیر وانتظام کرے۔ جو خود اپنے نفس کی تدبیر کا اہل نہ ہو، وہ دوسرے کے معاملات کی تدبیر وانتظام کا اہل نہیں ہوگا، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو دوسروں کے امور ومعاملات کی تدبیر کے لئے خود کو نامزد کریں،

۱- راغب اصفہانی، ابوالقاسم حسین بن محمد، ''الذریعۃ إلی مکارم الشریعۃ''، تحقیق: ابوالیزید، ابوزید عجمی، قاہرہ، دارالسلام، ط:۱، (۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء)، ص ۸۴۔

جبکہ خود اپنے نفس کو نظر انداز کر رہے ہوں، اور اپنے نفس کو مہذب، آراستہ و پیراستہ کئے بغیر نیکی کا حکم دے رہے ہوں اور برائی سے روک رہے ہوں، اللہ تعالی کا فرمان ہے:"**أتأمرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم وأنتم تتلون الكتاب أفلا تعقلون**"(سورۂ بقرہ:۴۴)(کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو فراموش کر بیٹھتے ہو، حالانکہ تم کتاب الہی کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم کچھ بھی عقل وخرد سے کام نہیں لیتے ہو)(۱)۔

۱-نفسانی عمل کی اصلاح کے سلسلہ میں اسلامی عبادتوں کا رول:

نفسانی عمل کی اصلاح کے سلسلے میں اسلامی عبادتیں زبردست کردار اور اہم رول ادا کرتی ہیں، چنانچہ نماز نفس کو پاک وصاف کرتی ہے، اور اس کی طہارت و پاکیزگی میں حصہ لیتی ہے؛ اس لئے کہ نماز ان نیک اعمال میں سے ایک ہے جو برے اعمال کے برے اور گندے اثرات کو مٹا دیتے ہیں، فرمان باری تعالی ہے:"**وأقم الصلوة طرفي النهار وزلفا من الليل إن الحسنات يذهبن السيئات**"(سورۂ ہود:۱۱۴)(اور دن کے دونوں حصوں میں نیز رات کے حصوں میں بھی نماز قائم کرو، یقیناً نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں)۔

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے:"**إن الصلوٰة تنهى عن الفحشاء والمنكر**"(سورۂ عنکبوت:۴۵)(یقیناً نماز بے حیائی، بدکاری اور برائی سے روکتی ہے)۔

روزہ کی مشروعیت کا مقصد بھی تقوی و پرہیزگاری ہے، اس لئے کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**يأيها الذين آمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون**"(سورۂ بقرہ:۱۸۳)(اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم متقی اور تقوی شعار بن جاؤ)۔

متعدد مظاہر میں تقوی کے مقصد کی جلوہ گری ہوتی ہے، ان میں سرفہرست یہ ہے کہ اللہ تعالی کے مراقبہ اور نگاہ میں رکھنے کے ملکہ کو پروان چڑھایا جائے اور اس سے حیا اختیار کی جائے،

۱- مرجع سابق، ص:۸۶۔

یہ سارے امور ایک طرف روزہ دار کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے نفس کو پاک کرے، طبعی خصلتوں کو منضبط کرے اور نفس کی خواہشات پر کنٹرول کرے، تو دوسری طرف روزہ دار کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے رحیمانہ اور جذبات پر مبنی احساسات کو بیدار کرے تا کہ وہ دوسروں پر خرچ کرے، ان کو نوازے اور ان پر مہربانی کرے۔

نفس کی اصلاحی تطہیر حج اور زکوۃ میں بھی عیاں ہے، حج کے سلسلے میں تو یہ بالکل واضح ہے، فرمان باری تعالی ہے:"**لن ینال الله لحومها ولا دماؤها ولكن يناله التقوى منكم**"(سورۂ حج:۳۷)(اللہ تعالی کو تمہاری قربانی کے گوشت و پوست اور خون نہیں پہنچتے ہیں، لیکن اسے تمہارا تقوی پہنچتا ہے)۔

ایک مقام پر اس طرح فرمایا گیا ہے:"**لكم فيها منافع إلى أجل مسمى**"(سورۂ حج:۳۳)(قربانی کے ان جانوروں میں ایک متعینہ وقت تک تمہاری منفعت کے بہت سے گوشے و پہلو ہیں)۔ایک دوسرے موقع سے ارشاد ہے:"**فمن فرض فيهن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال في الحج**" (سورۂ بقرہ:۱۹۷)(سو جو ان مہینوں میں حج کرنا طے کرے، وہ شہوانی باتیں نہ کرے، نہ فسق و معصیت کی حرکتیں کر بیٹھے، اور نہ حج کے موقع پر لڑائی اور جھگڑے میں مبتلا ہو)، نیز ارشاد باری تعالی ہے:"**وتزودوا فإن خير الزاد التقوى**" (سورۂ بقرہ:۱۹۷)(اور زاد راہ لے لو، یقیناً بہترین زاد راہ اور توشہ تقوی و پرہیز گاری ہے)۔

زکوۃ بھی مالدار کے اعتبار سے نفس کو بخل و کنجوسی کی خصلت سے پاک کرتی ہے، جبکہ فقیر کے لحاظ سے کینہ و کپٹ اور حسد و جلن کی خصلت سے اس کے نفس کو پاک کرتی ہے، لہذا زکوۃ میں ''تخلیہ'' اور ''تحلیہ'' دونوں ہیں: زکوۃ نفس کو فقراء و مساکین کے حالات کے عدم احساس اور بخل و کنجوسی کے میل کچیل اور آلودگی سے پاک کرتی ہے، جبکہ فقراء کے رنج و غم کے احساس، ان کے ساتھ تعاون، حسن سلوک اور کرم و مہربانی کے جذبات سے نفس کو مزین کرتی ہے(۱)۔

۱- فرمان باری تعالی:"لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون"(سورۂ آل عمران:۹۲)(تم نیکی کے

اللہ عز وجل کے ارشاد میں اسی کی طرف اشارہ ہے:''**خذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها**''(سورۂ توبہ:۱۰۳)(ان کے اموال سے صدقات وزکوۃ وصول کیجئے،اور ان کے ذریعہ ان کی تطہیر وتزکیہ فرمائیے)۔ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے:''**ومثل الذين ينفقون أموالهم ابتغاء مرضات الله وتثبيتا من أنفسهم**''(سورۂ بقرہ:۲۶۵)(اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور دل کے اطمینان کے ساتھ خرچ کرتے ہیں)۔

شیخ محمد رشید رضا کی رائے میں آیت میں دو مقصد کا تعین کیا گیا ہے، پہلا مقصد یہ ہے کہ خرچ کرنے کے ذریعہ عبادت کی انجام دہی ہو،جس کی بنا پر خرچ کرنے کا مقصود اللہ تعالی کی خوشنودی ہو۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ کمال تک پہنچنے میں جو مذموم خصلتیں حائل ہیں، جیسے: بخل وکنجوسی اور حرص وطمع، ان سے نفس کو پاک کیا جائے(۱)۔

۲-نفسانی عمل کی اصلاح کے سلسلہ میں محاسبہ کا رول:

نفس کی اصلاح کے سلسلہ میں ان ساری عبادتوں کا نمایاں اثر ہے۔ یہ عبادتیں نفس کو بیدار اور یاددہانی کی حالت میں رکھتی ہیں،اس کا ارادہ مضبوط ومستحکم رہتا ہے، نیز اسے سماجی شعور حاصل رہتا ہے،جس کی بنا پر ایسے نفس کا حامل شخص سماجی زندگی میں متحرک ونشیط رہتا ہے(۲)۔

ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔لیکن اس کے باوجود کہ یہ عبادتیں نفسانی اصلاح کو راسخ، پختہ اور مستحکم کرتی ہیں، ایک تکمیلی عنصر کی بھی ضرورت رہ جاتی ہے جو کہ'' محاسبہ'' ہے۔

مقام پر فائز نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ کرو) کی تفسیر دیکھئے: قطب، فی ظلال القرآن، مرجع سابق، ج ۳،ص:۳۰۷۔

۱- رضا، محمد رشید، ''تفسیر القرآن الحکیم''، ''تفسیر المنار''، تحقیق: فؤاد سراج عبدالغفار، قاہرہ: مکتبہ توفیقیہ، (د،ت)، ج ۳،ص:۶۷۔

۲- اس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے دیکھئے: حامدی، '' مقاصد القرآن من تشریع الأحکام''، مرجع سابق، عنوان:'' نفسانی اصلاح کے سلسلے میں عبادات کا اثر''،ص:۱۸۶،اور بعد کے صفحات۔

چنانچہ آدمی برابر اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے، اور اس کی غلطیوں کو درست کرتا رہتا ہے، اور اس کی تربیت، برے احساسات اور مذموم اخلاق کے محرکات کے عمل میں کمی لانے پر کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ برے احساسات اور مذموم اخلاق کے برے اثرات اختیار کرنے سے اسے مکمل طور پر نجات مل جاتی ہے۔ اس لئے کہ فرمان باری تعالی ہے: ''**ونفس وما سواها، فألهمها فجورها وتقواها، قد أفلح من زكاها، وقد خاب من دسها**'' (سورۂ شمس:۱۰) (قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے موزوں ومتناسب بنایا۔ اور اسکے اندر بدی اور پرہیزگاری کا مادہ رکھا۔ وہ شخص کامیاب ہوگیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنایا، اور وہ شخص ناکام ونامراد ہوا جس نے نفس کو آلودہ کیا)(۱)۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں محاسبہ کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فرمان باری تعالی ہے: ''**ولا أقسم بالنفس اللوامة**'' (سورۂ قیامہ:۲) (میں ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں)۔

جس قدر محاسبہ ایک مسلم کے دل سے منفی احساسات، جیسے: خود پسندی اور غرور وگھمنڈ وغیرہ کو دور کرے گا، اسی قدر تزکیہ نفس کو ان منفی احساسات کی ضد یعنی قلبی فضائل اور خوبیوں، جیسے: اخلاص، احسان، حسن نیت، صبر، توکل اور تقدیری فیصلے پر راضی رہنے جیسی خوبیوں کو پروان چڑھانے پر آمادہ کرے گا۔ یہ سارے وہ اخلاق وخصائل ہیں جن کو صحیح مواقع پر بہتر طریقہ پر استعمال کرنے کی قرآن کریم نے ترغیب دی ہے، اور ان پر آمادہ کیا ہے(۲)۔

۱- نفس کو پاکیزہ بنانے کا مفہوم یہ ہے کہ اسے پروان چڑھایا جائے اور علم صحیح اور علم کے تقاضے کے مطابق عمل صالح کے ذریعہ اسے کمال تک پہنچایا جائے؛ کیونکہ ''تزکیہ'' زکاء سے مشتق ہے، اور ''زکاء'' کے معنی ہیں: نمو وبڑھوتری، پھر اس جگہ ''تزکیہ'' سے مقصود نفس کو رذائل سے پاک کرنا ہے، اس لئے کہ یہ ایسی تطہیر ہے جو علم وعمل کے ذریعہ پروان چڑھا کر ہی ہوسکتی ہے۔ اور نفس کو آلودہ کرنا، نفس کو پاکیزہ بنانے کی ضد ہے، یعنی نفس کی خوبی میں کمی کرے۔ ''تدسیہ'' کی اصل ''دس'' ہے، اس کے معنی داخل کرنے کے ہیں، اس لئے کہ محسوسات کے اندر عمومی نقص اس آلہ کو داخل کرنے سے پیدا ہوتا ہے جو نقص شدہ شئ کے نقص کو ختم کرنے کے لئے بہ طور علاج داخل کیا جاتا ہے۔ دیکھئے: فقرہ نمبر:۱، ابن عاشور، اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام، مرجع سابق، ص:۱۲۵۔

۲- ان خصائل میں سے ایک ''توکل'' بھی ہے جو فرمان باری تعالی میں وارد ہے: ''**وشاورهم في الأمر**

محاسبہ اسی وقت مفید ہوگا جب ہم باطنی نفسانی واعظ پیدا کرلیں جو نفس کو حاصل کردہ منافع سے منحرف ہونے سے روکے، اور پیدا شدہ مصالح کو پروان چڑھانے پر قادر بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے انسانی نفوس کے اندر خوف ورجا دونوں کیفیتوں کو رکھا ہے۔ فرمان باری تعالی ہے:"**نبئ عبادي أني أنا الغفور الرحيم، وأن عذابي هو العذاب الأليم**" (سورۂ حجر:۴۹-۵۰) (میرے بندوں کو بتا دیجئے کہ میں بخشنے والا مہربان ہوں، اور یہ بھی بتا دیجئے کہ میرا عذاب بھی دردناک ہے)۔

اس باب میں علماء اسلام کی جو تحریریں ہم نے پڑھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ لطیف وعمیق تحریر امام ابن عاشورؒ کی درج ذیل تحریر ہے:

''امید وبیم.....انسانی نفوس کی سب سے بہترین وافضل ترین تدبیر ہے، اس لئے کہ اس میں خوف وخشیت اور محبت دونوں محرکوں کو ابھارا جاتا ہے، اور اس کی دائمی ریاضت ومشق سے محبت کا محرک غالب آجاتا ہے؛ کیونکہ محبت کا حال ہی یہ ہے کہ پروان چڑھتی رہتی ہے، اور اس میں نمو وافزائش ہوتی رہتی ہے، پھر جب محبت کا محرک غالب آجاتا ہے تو خشیت وقار بن جاتی ہے، اور اس کے تقاضے میں اختیاری طور پر اطاعت وفرمانبرداری ہوتی ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

فإذا عزمت فتوكل على الله إن الله يحب المتوكلين"(سورۂ آل عمران:۱۵۹) (اور ان سے معاملات میں مشورہ کیجئے، پھر جب آپ عزم مصمم اور پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ تعالی پر بھروسہ رکھیئے، یقیناً اللہ تعالی بھروسہ رکھنے والے کو پسند فرماتا ہے)، یہی حال خواتین کے اعتبار سے اطاعت وفرمانبرداری اور حفاظت کرنے کا ہے، اور مردوں کے لحاظ سے نگرانی وذمہ داری کا ہے، اس لئے کہ فرمان باری تعالی ہے:"**الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم، فالصالحات قانتات حافظات للغيب بما حفظ الله**"(سورۂ نساء:۳۴) (مرد خواتین کے نگراں وذمہ دار ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں، پس نیک خواتین مطیع وفرمانبردار ہوتی ہیں، اور شوہر کی عدم موجودگی میں اللہ کی حفاظت کے سہارے مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔

تعصي إلا له وأنت تظهر حبه هذا محال في القياس بديع

تم اللہ کی نافرمانی کرتے ہو، حالانکہ اس کی محبت کا اظہار بھی کرتے ہو، جبکہ یہ محال ہے اور عقل وخرد کے مطابق انوکھی ونرالی بات ہے۔

"لو كان حبک صادقا لأطعته إن المحب لمن يحب مطيع"

اگر تیری محبت سچی ہوئی تو تم ضرور اس کی اطاعت کرتے؛ کیونکہ محبت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا ہے(۱)۔

خلاصہ کلام یہ کہ نفسانی عمل کی قرآنی اصلاح ذاتی محاسبہ اور رذائل سے پاک ہونے اور فضائل اور خوبیوں سے آراستہ ہونے کو جمع کرنے والے تزکیہ پر مبنی ہے، اسلامی عبادتیں: جیسے نماز، زکوۃ، روزہ اور حج بھی اسی تزکیہ کو پختہ ومستحکم کرتی ہیں، لہذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ استاذ علوانی نے تزکیہ کو ان مرکزی اقدار میں سے ایک قدر (Value) قرار دیا ہے، جن پر اکثر قرآنی مقاصد کا دارومدار ہے؛ کیونکہ ان سب کا مرکزی عنوان خلیفہ بنائے گئے انسان کی صورت حال ہے کہ ایک خالق ومالک کی ہدایات اور تعلیمات کے مطابق اس کی مخلوقات کی نگہداشت رکھی جائے اور ان کے امور ومعاملات کا انتظام کیا جائے(۲)۔

۱- شافعی، محمد بن ادریس، دیوان الإمام الشافعی، تحقیق وشرح: یوسف شیخ محمد بقاعی، بیروت: دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، ط:۱، (۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء)، ص: ۸۲۔

امام ابن عاشورؒ نے اس شعر کی نسبت محمود وراق کی طرف کی ہے، اس کے الفاظ ہیں: "**تعصي إلا له وأنت تظهر حبه ...هذالعمري في القياس بديع**" (تم اللہ کی نافرمانی کرتے ہو، حالانکہ اس کی محبت کا اظہار بھی کرتے ہو، اللہ کی قسم! یہ عقل وخرد کے مطابق نرالی وانوکھی بات ہے۔ "**لو كان حبک صادقا لأطعته...إن المحب لمن يحب مطيع**" (اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تم ضرور اس کی اطاعت کرتے، یقیناً محبت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے، اس کی اطاعت بھی کرتا ہے)۔ ابن عاشور، اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۸۴۰۔

۲- اس سلسلہ میں درج ذیل مقالوں کی مراجعت کی جائے: ملکاوی، فتحی حسن، "التزکیۃ في منظومۃ القیم الحاکمۃ"، مجلۃ اسلامیۃ المعرفۃ، شمارہ: ۵۷، ۲۰۰۹ء، ص: ۵ اور بعد کے صفحات، ملکاوی، فتحی حسن، "العمران في منظومۃ القیم الحاکمۃ"، مجلۃ اسلامیۃ المعرفۃ، شمارہ: ۵۹، ۲۰۱۰ء، ص: ۵، اور اس کے بعد کے صفحات۔

حاصل یہ کہ نفسانی عمل کی اصلاح ''تخلیہ'' اور ''تحلیہ'' کے درمیان تدافع کے درجہ میں ہے، یعنی جاہلیت کے اخلاق واطوار سے کنارہ کشی کی جائے، اور قرآن کریم کے پیش کردہ اور نبی آخرالزماں محمد بن عبداللہ علیہ الصلاوۃ والسلام کے عملی جامہ پہنائے ہوئے عمدہ واعلی اخلاق سے خودکو مزین وآراستہ کیا جائے۔

مبحث دوم
جسمانی عمل

قرآن مجید میں وارد اصلاح کے بدنی وجسمانی وفزیکل مظہر میں ہم دو پہلوؤں کے درمیان امتیاز کریں گے۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ قرآن مجید جسم کی درستگی کا بھی بڑا اہتمام کرتا ہے، یعنی جسم امراض سے صحیح وسالم رہے اور صحت وعافیت اور تندرستی کا حامل ہو۔

دوسرا پہلو: ''صلاح'' اور ''فساد'' کے مادہ کے پیش کردہ حقائق ہیں، جن سے قرآنی اوامر واحکامات اور نواہی وممنوعات کے ساتھ جسمانی اعضاء وجوارح کے تعامل کی نوعیت ظاہر ہوتی ہے۔

۱-جسمانی سلامتی اور بدنی عمل کی اصلاح:

اس جسمانی مظہر کے تعین کے سلسلے میں ایک اسکالر ومحقق صرف ''صلاح'' یا ''فساد'' کے مادہ کے استقراء کے پیش کردہ حقائق اور واضح دلائل پر ہی اکتفا نہیں کرسکتا ہے؛ اگرچہ وہ بھی اہم اور مفید ہیں، لیکن اگر ان کو قرآن مجید جس عمومی مقصد کے لئے نازل ہوا ہے، اس سے مربوط نہیں کیا جائے، تو وہ ناقص رہیں گے، چنانچہ انسان اللہ تعالی کے خلیفہ کی حیثیت سے ناکارہ جسمانی ڈھانچہ کے ساتھ مکلّف اور پابند شرائع واحکام ہونے کی امانت کو ادا نہیں کرسکتا ہے۔ سو سب سے پہلے اور ہر چیز سے پہلے مطلوب یہ ہے کہ آدمی اس ڈھانچہ کی جسمانی سلامتی کا تحفظ کرے، جس طرح انسان سے اپنے روحانی ڈھانچہ کی سلامتی کے تحفظ کا مطالبہ ہے، اسی طرح اسی وقت اس سے اپنے جسمانی ڈھانچہ کی سلامتی کے تحفظ کا بھی مطالبہ ہے۔

اس کی وجہ ''راغب اصفہانیؒ'' کے الفاظ میں یہ ہے کہ: انسان دو جوہروں کے درمیان ایک متوسط مخلوق ہے، ایک گھٹیا جوہر ہے جو کہ حیوانات ہیں، اور ایک بلند جوہر ہے جو کہ فرشتے ہیں۔ خالق و مالک اللہ تعالی نے جانور اور فرشتے کی دو دنیا کی طاقتوں کو انسان کے اندر اکٹھا کر دیا ہے۔ اس طرح خالق و مالک نے انسان کو جسمانی شہوت، غذا، تناسل وتوالد اور لڑائی وجھگڑے وغیرہ حیوانی اوصاف میں حیوان وجانور کی طرح بنایا ہے، جبکہ عقل، علم، صداقت اور وفا کشی وغیرہ روحانی اوصاف کی طاقتوں کے حامل ہونے میں اسے فرشتوں کی طرح بنایا ہے(۱)۔

اس طرح سب سے پہلے اور ہر چیز سے پہلے اصلاحی تصور کی روح انسان کے جسمانی وبدنی مظہر اور ان اعضاء وجوارح کی ساخت سے متعلق ہے، جن کا ہم احساس کرتے ہیں اور جن کے ڈھانچہ کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید کے مطابق مطلوب یہ ہے کہ یہ مظہر صحیح سالم، تندرست اور مرض سے دور رہے، نیز یہ جسم صحیح وسالم اور صحتمند رہے، اس پر زیادتی نہ کی جائے، خواہ یہ زیادتی قتل اور ہلاک کرنے کے ذریعہ ہو، یا جسم کے کسی حصہ اور عضو پر زیادتی کے ذریعہ ہو، مثلاً: کسی عضو، جیسے: آنکھ، کان اور ناک پر زیادتی ہو(۲)۔ چنانچہ قصاص کی مشروعیت کا مصلحت پر مبنی مقصد زندگی کے حق کی فراہمی وقدرت ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''**ولكم في القصاص حيوة يأولى الألباب لعلكم تتقون**''(سورۂ بقرہ:۱۷۹)(اے عقل وخرد رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے یعنی قصاص زندگی کے تحفظ کا ذریعہ ہے، ممکن ہے تم (ظلم

۱- راغب اصفہانی، ابو القاسم حسین بن محمد، ''تفصیل النشأتین وتحصیل السعادتین، بیروت، دار النفائس، ط:۱، (۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء)، ص ۶۴۔

۲- اسی وجہ سے قرآن مجید نے ''قصاص'' کو مشروع قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''**كتب عليكم القصاص في القتلى**''(سورۂ بقرہ:۱۷۸)(مقتولین کے سلسلہ میں تم پر قصاص لازم قرار دیا گیا ہے)، نیز فرمان باری تعالی ہے: ''**وكتبنا عليهم فيها أن النفس بالنفس والعين بالعين والأنف بالأنف والأذن بالأذن والسن بالسن والجروح قصاص**''(سورۂ مائدہ:۴۵)(ہم نے توریت میں ان پر فرض قرار دیا تھا کہ جان کے بدلہ جان ہے، آنکھ کے بدلہ آنکھ ہے، ناک کے بدلہ ناک ہے، کان کے بدلہ کان ہے اور دانت کے بدلہ دانت ہے، اور زخموں میں بھی قصاص ہے۔

وزیادتی سے) بچو)۔

جسمانی درستگی کی قرآن مجید نے متعدد الفاظ میں تعبیر کی ہے، کبھی اچھی شکل کے الفاظ سے تعبیر کی ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی میں مذکور ہے:"**وصورکم فأحسن صورکم**" (سورۂ غافر:۶۴)(اس نے تمہاری صورت گری کی اور بہترین صورت گری کی)، اور کبھی بہترین ساخت کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے، فرمان الٰہی ہے:"**لقد خلقنا الإنسان في أحسن تقويم**"(سورۂ تین: ۴)(ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے)۔کبھی جسمانی قوت سے اس کی تعبیر کی گئی ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:"**إن الله اصطفاه عليكم وزاده بسطة في العلم والجسم**"(سورۂ بقرہ:۲۴۷)(یقیناً اللہ تعالی نے تمہارے اوپر اسے ترجیح دیتے ہوئے اس کا انتخاب کیا ہے، اور علم اور جسمانی قوت میں اسے فوقیت دی ہے)، نیز اللہ عزوجل کا فرمان ہے:"**وزادكم في الخلق بصطة**"(سورۂ اعراف:۶۹)(اور اس نے خلقی لحاظ سے تمہیں ڈیل ڈول والا بدن اور قوت سے لبریز جسم عطا کیا)،حق یہ ہے کہ انسانی جسم صحیح وسالم رہے بغیر زندگی کے اعمال اور وظائف وفرائض ادا نہیں کئے جاسکتے ہیں، نیز انسانی جسم تندرست اور صحیح وسالم اسی وقت رہ سکتا ہے، جبکہ کھانے پینے اور لباس وغیرہ روزمرہ کی ان ضروریات میں سے انسان اپنا حصہ لے، جن کا بیان قرآن مجید کی ایک سے زائد آیتوں میں ہے۔

کھانے اور پینے کے سلسلے میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:"**وكلوا واشربوا ولاتسرفوا**"(سورۂ اعراف:۳۱)(کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو)، چنانچہ اسراف اور حد سے تجاوز کرنا ممنوع ہے؛ اس لئے کہ اس سے جسم پر بہت سی مضرتیں اور نقصانات مرتب ہوتے ہیں، اور دشوار ولاعلاج امراض پیدا ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ: چونکہ اس آیت کریمہ نے اسراف کو ممنوع ٹھہرایا ہے، اس لئے کہ یہ غذا کے پہلو سے حفظان صحت کے اصول کی جامع ہے(۱)۔

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۸،ص:۹۶، وج۹،ص:۱۳۵۔

نیز فرمان باری تعالی ہے:"**وهو الذي سخر البحر لتأكلوا منه لحما طريا**"(سورۂ نحل:۱۴)(اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے، تا کہ تم اس سے تازہ گوشت یعنی مچھلی کھاؤ)۔

ایک دوسرے مقام پر فرمان الٰہی ہے:"**وإن لكم في الأنعام لعبرة نسقيكم مما في بطونه من بين فرث ودم لبنا خالصا سائغا للشاربين**"(سورۂ نحل:٦٦)(یقیناً تمہارے لئے چوپایوں میں نشان عبرت ہے، ہم خون اور گوبر کے درمیان سے ان کے پیٹوں میں موجود خالص دودھ تمہیں پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے)۔

ایک دوسری آیت میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**يأيها الناس كلوا مما في الأرض حلالا طيبا**" (سورۂ بقرہ:۱٦۸)(اے لوگو! زمین میں موجود چیزوں میں سے حلال اور پاکیزہ روزی کھاؤ)۔

ایک تیسری آیت میں اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے:"**وكلوا مما رزقكم الله حلالا طيبا**" (سورۂ مائدہ:۸۸)(اور اللہ تعالی نے جو تمہیں حلال اور پاکیزہ رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ)۔

پاکیزہ چیزوں میں وہ ساری چیزیں داخل ہیں، جن کو معتدل معیشت کے حامل فطرت سلیمہ رکھنے والے نفوس اپنی طبیعت کے تقاضے میں پاکیزہ سمجھتے ہیں، اور ان چیزوں کو شوق سے کھاتے ہیں، انسان جن چیزوں کو شوق سے کھاتا ہے، ان ہی چیزوں کو بہ سہولت وآسانی ہضم کر پاتا ہے، اور ان ہی چیزوں سے صحیح غذا حاصل کرتا ہے۔لیکن جن چیزوں کو انسان قبیح سمجھتا ہے، اور ان سے اس کی طبیعت ابا کرتی ہے، ان کو بہ آسانی ہضم نہیں کر پاتا ہے، اور ان سے صحیح غذا حاصل نہیں کر پاتا ہے، بلکہ بالعموم اس طرح کی چیزوں سے اسے ضرر لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ پاکیزہ چیزوں کو حرام ٹھہرالینا زیادتی کی ان قسموں میں سے ایک ہے جن سے اللہ تعالی نے اپنے اس ارشاد میں منع فرمایا ہے:"**يأيها الذين آمنوا لا تحرموا طيبات ما أحل الله لكم**

و لا تعتدوا'' (سورۂ مائدہ:۸۷)(اے ایمان والو! اللہ نے تمہارے لئے جن پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے ان کو حرام نہ ٹھہراؤ، اور حد سے تجاوز نہ کرو)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکیزہ چیزوں کے استعمال میں بھی جد اعتدال سے تجاوز کر کے جسم کو ضرر لاحق کرنے والے اسراف میں داخل ہو کر زیادتی کے شکار مت بنو، مثلاً: شکم سیری اور سیرابی سے زیادہ مقدار کا استعمال نہ کرو۔ شیخ محمد رشید رضا رقم طراز ہیں ''اللہ سبحانہ نے اس امت پر مہربانی فرمائی ہے اور اسے معتدل اور بہترین وافضل امت بنایا ہے۔ یہ امت جسم کو بھی اس کا حق دیتی ہے اور روح کو بھی اس کا حق دیتی..... چنانچہ اللہ عزوجل نے ہمارے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے، تاکہ ہمارے حق میں اس کی جسمانی نعمتوں کا دائرہ وسیع ہو، اس نے ہمیں ان نعمتوں کی شکر گزاری کا بھی حکم دیا ہے، تاکہ ہمیں ان میں عقلی اور روحانی فوائد بھی حاصل ہوں۔ اس طرح ہم چوپایوں کی طرح محض جسم کے حامل جاندار نہیں ہیں، اور نہ ہی فرشتوں کی طرح خالص روحانیت کے حامل ہیں''(۱)۔

جن اشیاء خورد ونوش کے استعمال سے جسمانی صحت کو ضرر اور نقصان لاحق ہوتا ہے، ان کی ممانعت کے سلسلے میں مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی حرمت وارد ہے(۲)، نیز شراب

۱- رضا، تفسیر القرآن الحکیم: ''تفسیر المنار''، مرجع سابق، ج ۲، ص: ۹۶-۹۷، ج ۷، ص: ۱۸۔

۲- مردار کی حرمت سے مقصود جسمانی مصالح یا مقاصد کے بارے میں متعدد آراء ہیں: امام رشید رضاؒ کی رائے ہے: اللہ تعالی نے مردار کو اس لئے حرام قرار دیا ہے کہ طبیعت سلیمہ اسے گندہ اور قابل گھن قرار دیتی ہے، نیز اس کی مضرت ونقصان کا بھی اندیشہ ہے؛ کیونکہ وہ یا تو گذشتہ مرض سے مرتے ہیں یا طاری ہونے والی علت سے ہلاک ہوتے ہیں، اور دونوں حالتوں میں ایسے جانوروں سے لاحق ہونے والے ضرر کا اندیشہ ہے.....مزید برآں انسانی عمل سے ان کو ہلاک کرنے کا قصد بھی نہیں پایا گیا ہے، دیکھئے: رضا، تفسیر القرآن الحکیم ''تفسیر المنار''، مرجع سابق، ج ۲، ص: ۹۷-۹۸۔

دوسری رائے امام ابن عاشورؒ کی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں: ''میری رائے میں مردار کی حرمت کی حکمت یہ ہے کہ جانور مرض میں مبتلا ہو کر ہی عام طور سے ہلاک ہوتے ہیں، یہ بیماریاں مختلف ہوتی ہیں، اور طبعی موت کی صورت میں جانور کے گوشت میں بیماریوں کے بہت سے اجزاء رہ جاتے ہیں، اب اگر انسان مردار کو کھائے گا تو اسکے خون میں بیماری کا اثر پایا جاسکتا ہے، جبکہ ذبح کردہ جانور میں یہ علت نہیں پائی جاتی ہے، اس لئے کہ ذبح کردہ جانور بالعموم بغیر کسی

نوشی کوحرام قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی میں مذکور ہے:''**حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر**''(سورۂ مائدہ:۳)(تم پر مردار، خون اور خنزیر کا گوشت حرام قرار دیا گیا ہے)۔ ایک دوسرے موقع پر ارشاد الٰہی ہے:''**إنما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما أهل به لغیر الله**.....''(سورۂ بقرہ:۱۷۳)(اللہ تعالی نے تم پر صرف مردار، خون اور سور کا گوشت اور غیر اللہ کے لئے نامزد کئے ہوئے جانور کو حرام ٹھہرایا ہے)۔ ایک آیت میں ہے:''**قل لا أجد في ما أوحي إلي محرما علی طاعم یطعمه إلا أن یکون میتة أو دما مسفوحا**''(سورۂ انعام:۱۴۵)(آپ کہہ دیجئے: میں اس وحی کے مطابق جو مجھ پر نازل کی گئی، کسی کھانے والے پر جو کھائے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا ہوں، مگر یہ کہ وہ مردار یا بہتا ہوا خون ہو)۔ ایک دوسرے مقام پر فرمان باری تعالی ہے:''**إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون**''(سورۂ مائدہ:۹۰)(یقیناً شراب، جوا، بتوں کے استھان اور قسمت معلوم کرنے کے تیر گندی چیزیں ہیں اور شیطان کے اعمال میں سے ہیں، لہذا ان سے بچو، ممکن ہے کہ تم کامیاب ہوجاؤ)، نیز فرمان باری تعالی ہے:''**ویحرم علیهم الخبائث**''(سورۂ اعراف:۱۵۷)(اور ان پر گندی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے)۔

بیماری کے مرتا ہے، نیز اس میں موجود خون کو بہا دینے سے اس کا گوشت ان مضرتوں سے جن کا اندیشہ ہوتا ہے، پاک و صاف ہوجاتا ہے، دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۲، ص:۱۱۷۔

امام ابن عاشورؒ کی وضاحت کے مطابق خنزیر کی حرمت کا مقصد یہ ہے کہ وہ بہ کثرت گندی چیزیں کھاتا ہے، جس سے اس کے گوشت میں کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں، ان خوراکوں کی وجہ سے جن کو اس کا معدہ ہضم نہیں کر پاتا ہے، جب اس کا گوشت کھانے والا، ان کیڑوں کی زد میں آتا ہے، تو وہ اس کے لئے مہلک ثابت ہوتے ہیں، دیکھئے: مرجع سابق، ج۲، ص۱۱۹۔

شراب نوشی اور خنزیر کی حرمت کے جسمانی اور مصلحت پر مبنی مقاصد کی مزید واقفیت کے لئے دیکھئے: رضا، تفسیر القرآن الحکیم ''تفسیر المنار''، مرجع سابق، ج۶، ص:۱۵۳-، ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۲، ص:۳۴۳۔

''گندی وخبیث چیزیں'' خوردونوش کی وہ ساری اشیاء ہیں جو انسانی جسم کے لئے نقصان دہ ہیں، خواہ نجاست ہوں یا گھن آنے والی چیزیں ہوں، جن کو قرآن مجید نے'' رجس'' اور گندگی سے موسوم کیا ہے۔ اس طرح جسم کی سلامتی اور درستگی کے تحفظ کی خاطر گندی چیزوں کا استعمال حرام ہے۔ اس سے صرف ضرورت واضطرار اور مجبوری کی حالتوں کا استثناء ہے تا کہ موت سے زندگی کی حفاظت ہوسکے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**وما لكم ألا تأكلوا مما ذكراسم الله عليه وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلاما اضطررتم إليه**''(سورۂ انعام:۱۱۹) (تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم ان جانوروں سے نہ کھاؤ، جن کو ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام لیا گیا، حالانکہ اسنے ان چیزوں کو کھول کر بیان کر دیا ہے جن کو تم پر حرام قرار دیا ہے، مگر یہ کہ تم ان کے استعمال پر مجبور ہو جاؤ)۔

ایک دوسرے موقع پر ارشاد الٰہی ہے:''**قل لا أجد في ماأوحى إلي محرما على طاعم يطعمه إلا أن يكون ميتة أودما مسفوحا أو لحم خنزير فإنه رجس أو فسقاأهل لغير الله به فمن اضطر غيرباغ ولا عاد فإن ربک غفور رحيم**'' (سورۂ انعام:۱۴۵) (آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر جو وحی نازل ہوتی ہے اس میں کھانے والے پر جن چیزوں کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے، اس میں یہی پاتا ہوں کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو کہ وہ نجس و ناپاک ہے، یا بہ طور فسق، یعنی خلاف قانون ذبح کے وقت اس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ پھر جو مجبور ہو جائے، اور اس کے اندر حرام کی چاہت وطلب نہ ہو اور نہ وہ کھانے میں حد سے تجاوز کرے (تو ان شرائط کے ساتھ ممنوعات کا استعمال کرسکتا ہے)، یقیناً تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے)۔

ایک آیت میں ارشاد الٰہی ہے:''**فمن اضطر غير باغ ولا عاد فإن الله غفور رحيم**''(سورۂ نحل:۱۱۵) (سو جو مجبور و مضطر ہو جائے اور اس کے اندر حرام کی طلب و چاہت نہ ہو، اور نہ وہ کھانے میں (ضرورت کی) حد سے تجاوز کرے (تو ان قیود و شرائط کے ساتھ وہ ممنوع چیز

کا استعمال کرسکتا ہے، بے شک اللہ تعالی بخشنے والا اور مہربان ہے)۔

نیز ایک دیگر مقام پر فرمان باری تعالی ہے:"**فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه إن الله غفور رحيم**"(سورۂ بقرہ:۱۷۳)(پھر جو مضطر و مجبور ہو جائے اور اس کے اندر حرام کی چاہت وخواہش نہ ہو، اور نہ کھانے میں (ضرورت کی) حد سے تجاوز کرے (تو بدرجہ مجبوری ممنوعات کے استعمال کے سلسلے میں) اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا اور نہایت رحم والا ہے)(۱)۔

اس طرح اصلاحی مقصد بدن کی سلامتی اور تندرستی کا تحفظ ہے، خواہ نماز، روزہ، حج اور جہاد جیسے فرائض کی تعمیل ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو۔ چنانچہ مریض کو مرض میں اضافہ، یا صحت یابی میں دیری کا اندیشہ ہو تو رمضان میں اس کے لئے قرآن کریم میں افطار کی رخصت دی گئی ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**ومن كان مريضا أو على سفر فعدة من أيام أخر يريد الله بكم اليسر ولايريدبكم العسر**"(سورۂ بقرہ:۱۸۵)(اور جو بیمار ہو یا مسافر ہو اور روزہ نہ رکھ سکے) وہ دوسرے دنوں کی گنتی کر کے (چھوٹے ہوئے روزے کی قضا کرلے)، اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے، اور تمہارے حق میں دشواری کرنا نہیں چاہتا ہے)۔

اسی طرح اللہ تعالی نے ان لوگوں کے لئے رمضان میں روزہ نہ رکھنے کو مباح قرار دیا ہے جو روزہ کی قدرت نہ رکھتے ہوں، ارشاد باری تعالی ہے:"**وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين**"(سورۂ بقرہ:۱۸۴)(جن لوگوں کے لئے روزہ رکھنا انتہائی دشوار ومشکل ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ میں دے)۔

جس طرح قرآن کریم نے اس مریض کے لئے تیمّم کو مباح قرار دیا ہے جسے پانی کے استعمال کی صورت میں (ہلاکت وغیرہ) کا اندیشہ ہو، اسی طرح قرآن پاک نے پانی موجود نہ

۱- اس پہلو کی مزید معلومات کے لئے دیکھئے: حسنی، اسماعیل،"الاقتراض البنكي والاضطرار الشرعي"، مراکش، المطبعہ والوراقہ الوطنیہ، ط:۲، ۲۰۱۳ء، فصل پنجم۔

ہونے کی صورت میں مسافر کے لئے بھی تیمّم کو مباح قرار دیا ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: **"وإن كنتم مرضٰ أو على سفر أو جاء أحدمنكم من الغائط أو لامستم النساء فلم تجدوا ماء فيتمموا صعيدا طيبا"** (سورۂ نساء:۴۳، مائدہ:۶) (اور اگر تم بیمار ہو، یا مسافر ہو، یا تم میں سے کوئی بیت الخلا سے آیا، یا تم نے بیویوں سے ہمبستری کی، اور تمہیں پانی دستیاب نہ ہو تو تم پاک مٹی سے تیمّم کرلو)۔

جس طرح قرآن پاک نے حج کے دوران ''منیٰ'' کے دنوں میں جلدی کرتے ہوئے دو دن یعنی ۱۲/ذی الحجہ کو ہی منیٰ سے روانگی کو مباح قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: **"فمن تعجل في يومين فلا إثم عليه ومن تأخر فلا إثم عليه لمن اتقى"** (سورۂ بقرہ:۲۰۳) (اب جو جلدی کرتے ہوئے ''منیٰ'' میں دو دن رہ کر ہی (۱۲/ذی الحجہ کو) ''منیٰ'' سے روانہ ہوجائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور جو ٹھہرا رہے یعنی ۱۳/ذی الحجہ کو روانہ ہو تو اس سے بھی کوئی باز پرس نہیں، بشرطیکہ وہ تقوی اختیار کرے)۔

چونکہ سفر میں عام طور سے مشقت ہوتی ہے، اس لئے قرآن کریم نے مسافروں کے حق میں تخفیف کی ہے، اور ان کو ان امور کا پابند نہیں بنایا ہے جن کا اقامت پذیر لوگوں کو پابند بنایا ہے، چنانچہ ان کو نماز میں ''قصر'' (چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھنے) کی رخصت دی ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: **"وإذا ضربتم في الأرض فليس عليكم جناح أن تقصروا من الصلوٰة"** (سورۂ نساء:۱۰۱) (جب تم سفر میں ہو تو نماز میں ''قصر'' کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

مریض کو ''جہاد'' کا پابند نہیں بنایا گیا ہے تاکہ وہ اپنے بدن کو مشقت لاحق ہونے سے بچائے۔ ارشاد باری تعالی ہے: **"ليس على الأعمى حرج ولا على الأعرج حرج ولا على المريض حرج"** (سورۂ فتح:۱۷) (نابینا پر کوئی حرج نہیں ہے، نہ ہی لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ ہی بیمار پر کوئی حرج ہے)۔

لباس وپوشاک کے سلسلے میں فرمان باری تعالی ہے:"**یا بنی آدم قد أنزلنا علیکم لباسایوٰري سوءٰ تکم وریشا ولباس التقوی ذلک خیر**"(سورۂ اعراف:۲۶) (اے اولاد آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس وپوشاک کا انتظام کیا جو تمہارے ستر کو چھپاتا ہے اور اس میں زینت وزیبائش بھی ہے، اور لباس تقوی یہ سب سے بہتر ہے)۔اس بارے میں اللہ عزو جل کا یہ فرمان بھی وارد ہے: "**وھو الذي سخر البحر لتأکلوا منه لحما طریا وتستخرجوا منه حلیة تلبسونها**"(سورۂ نحل:۱۴)(وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تا کہ اس سے تم تازہ گوشت یعنی مچھلی کھاؤ اور پہننے کے لئے اس سے زیورات اور زینت کی چیزیں نکالو)، ایسے ہی اللہ رب العزت کا یہ ارشاد بھی ہے:"**واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا وجعل لکم من جلود الأنعام بیوتا تستخفونها یوم ظعنکم ویوم إقامتکم ومن أصوافها وأوبارها وأشعارها أثاثا ومتعا إلی حین**"(سورۂ نحل:۸۰) (اللہ ہی جس نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو باعث سکون وراحت بنایا ہے، اور تمہارے لئے چوپایوں کی کھالوں کے گھر بھی بنائے ہیں، جنہیں تم اپنے کوچ کے دن اور اقامت پذیری کے دن اٹھائے پھرتے ہو، اور چوپایوں کے اونوں اور بالوں سے تم ساز وسامان اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانے کی چیزیں بناتے ہو)۔

حسی طہارت وپاکی اور نظافت وصفائی جو امراض واسقام سے بچاؤ کا ذریعہ ہے، اسی کے مدنظر قرآن کریم نے بیویوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، یہاں تک کہ وہ حیض کے خون سے پاک وصاف ہوجائیں۔ارشاد باری تعالی ہے:"**ولا تقربوھن حتی یطھرن**"(سورۂ بقرہ:۲۲۲)(اور بیویوں سے صحبت نہ کرو یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائیں)، اسی طرح فرمان باری تعالی میں نظافت وصفائی کا بھی حکم دیا گیا ہے:"**وثیابک فطھر**"(سورۂ مدثر:۴)(اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے)۔

یعنی ہر طرح کے میل وکچیل سے کپڑوں کو پاک وصاف رکھنا اور نجاستوں اور گندگیوں

سے ان کی حفاظت کرنا صرف عبادتوں جیسے نماز اور حج وعمرہ کے شعائر کی ادائیگی کے درمیان ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ تمام حالات وکوائف اور مختلف حیثیتوں کے اندر بھی لازم ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے آسمان سے پانی نازل کرنے کی وجہ سے بندوں پر احسان جتایا ہے، ارشاد الٰہی ہے:''**وینزل علیکم من السماء ماء لیطھرکم بہ**''(سورۂ انفال:۱۱)(اور وہ تمہارے لئے آسمان سے(یعنی اوپر سے) پانی برساتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں پاک کردے)(۱)۔

اللہ تعالی نے پاکباز اور پاک وصاف رہنے والے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالی میں مذکور ہے:''**لمسجد أسس علی التقوی من أول یوم أحق أن تقوم فیہ ، فیہ رجال یحبون أن یتطھروا واللہ یحب المطھرین**''(سورۂ توبہ:۱۰۸) (یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی روز سے تقوی پر رکھی گئی ہے زیادہ سزاوار ہے کہ آپ اس میں عبادت کریں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک وصاف رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ بھی پاک وصاف رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے)۔

اس سے یہ امر عیاں ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو نہ صرف رذائل، گھٹیا امور، گندے اخلاق اور خواہشات سے اپنی روح کی پاکیزگی کی حفاظت کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنے جسم کی پاکی وصفائی کی بھی حفاظت کرتے ہیں، چنانچہ وہ اپنے جسم کی حفاظت کی خاطر حفظان صحت کے وسائل

۱- فرمان باری تعالی:''**مایرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم ولیتم نعمتہ علیکم لعلکم تشکرون**''(سورۂ مائدہ:۶)(اللہ تعالی تمہارے اوپر کسی طرح کی تنگی نہیں ڈالنا چاہتا ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کردے اور تمہارے اوپر اپنی نعمت اور احسانات مکمل کردے تاکہ تم شکرگزاری کرو)، اس آیت کی تفسیر کے سیاق میں شیخ رشید رضا رقم طراز ہیں:''اللہ تعالی تمہیں گندگی، تکلیف دہ چیزوں اور رذائل سے پاک کردینا چاہتا ہے.....کہ تم جسم کے اعتبار سے سب سے زیادہ صاف وستھرے رہو، اور نفس وقلب کے اعتبار سے لوگوں کے اندر سب سے زیادہ پاکیزہ دل کے حامل رہو، اور جسم کے اعتبار سے سب سے زیادہ صحت مند رہو اور روح کے لحاظ سے سب سے اعلی وبرتر رہو، اور جسم کی پاکی اور صحت وتندرستی اور روح کی پاکیزگی اور تزکیہ کو جمع کرکے''تمہارے اوپر اپنے احسانات مکمل کردے''؛ کیونکہ انسان جسم وروح دونوں کا نام ہے، اس کی انسانیت ایک ہی ساتھ جسم وروح دونوں کے کمال سے مکمل ہوتی ہے، دیکھئے: رضا، تفسیر القرآن الحکیم''تفسیر المنار''، مرجع سابق، ج۶، ص:۲۵۸۔

اختیار کرنے کی بھی سعی وکاوش کرتے ہیں، اس طرح ان کے جسم میل وکچیل گندگیوں اور نجاستوں سے دور رہتے ہیں۔

اللہ تعالی نے زمین اور اس کی ساری چیزوں اور کائنات اور اس کی تمام چیزوں کو اس لئے پیدا فرمایا ہے کہ انسان ان کا استعمال کرے تا کہ اس کی مختلف مصلحتیں پوری ہوں، جن میں سے ایک جسمانی مصلحت بھی ہے، ارشاد باری تعالی ہے:"**هو الذي خلق لكم ما في الأرض جميعا**"(سورۂ بقرہ:۲۹)(اسی نے تمہارے (نفع کے) لئے زمین کی ساری چیزوں کو پیدا فرمایا)، نیز ایک دوسری آیت میں اللہ عزوجل کا فرمان ہے:"**وسخر لكم ما في السموات وما في الأرض جميعا منه**"(سورۂ جاثیہ:۱۳)(اور اسی نے تمہارے لئے آسمان و زمین کی ساری چیزوں کو پیدا کیا، سب اسی کی طرف سے ہے)۔

ایک دیگر مقا پر ارشاد الٰہی ہے:"**ولقد مكّنٰكم في الأرض وجعلنا لكم فيها معايش**"(سورۂ اعراف:۱۰)(اور ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار بخشا اور ہم نے اس میں معیشت وزیست کے ساز وسامان اور اسباب رکھے)۔

زمین اپنے تمام قدرتی مناظر: نہروں، وادیوں، سمندروں کھیتیوں اور زمین میں رینگنے والے جانوروں اور دیگر جانداروں سمیت انسان کے لئے اللہ تعالی کی طرف سے مسخر کردہ ہیں، تا کہ اس کی جسمانی مصلحت پوری ہے۔ بلکہ اللہ تعالی نے اسی مقصد کی خاطر زمین کو پھیلایا ہے۔ فرمان باری تعالی ہے:"**والأرض مددناها وألقينا فيها رواسي**"(سورۂ حجر:۱۹)(اور اس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں مضبوط پہاڑ کھڑے کئے)، زمین کے پھیلے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فراش وبستر کی شکل میں بچھی ہوئی اور مسطح وہموار ہے تا کہ اس میں بہ آسانی تگ ودو ہو سکے اور جسمانی سرگرمی انجام پا سکے(۱)۔

اسی طرح اللہ تعالی نے اس زمین کو انسان کے لئے ہموار ومسطح بنایا ہے، تا کہ وہ اس

۱- شوکانی، فتح القدیر، مرجع سابق، ج۴، ص:۱۴۶۔

میں چل پھر سکے، اور اس کی جسمانی صحت وتندرستی پر اس کا مثبت اثر مرتب ہو، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**هو الذي جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه**" (سورۂ ملک:۱۵) (وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ہموار بنایا، سو اس کے اطراف اور راستوں پر چلو اور اس کی روزی سے کھاؤ)۔

اللہ تعالی نے اپنی زمین کو دشوار گذار یا کھردرا نہیں بنایا ہے، بلکہ اسے نرم وہموار بنایا ہے، اس سے چلت پھرت، تگ ودو، سرگرمی اور قوت وزندگی سے لبریز حرکت ونشاط میں مدد ملتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالی نے فلکیاتی نظام کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ انسان کی جسمانی مصلحت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہے، چنانچہ سورج، چاند اور رات ودن کی گردش اور ان سب کے اندر موجود منافع سے انسان اپنی راحت اور نیند کے سلسلے میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس سے متعلق قرآن کریم کی بہت سی آیتیں ہیں، جیسے: فرمان باری تعالی ہے:"**إن الله فالق الحب والنوى يخرج الحي من الميت ومخرج الميت من الحي ذلكم الله فأنى تؤفكون، فالق الإصباح وجعل الليل سكنا والشمس والقمر حسبانا ذلك تقدير العزيز العليم، وهو الذي جعل لكم النجوم لتهتدوا بها في ظلمات البر والبحر قدفصلنا الآيات لقوم يعلمون، وهو الذي أنشأكم من نفس واحدة فمستقر ومستودع**" (سورۂ انعام:۹۵-۹۸) (یقیناً اللہ تعالی دانہ اور گٹھلیوں کو پھاڑتا ہے (یعنی ان سے کونپل نکالتا ہے)، زندہ کو مردہ سے پیدا کرتا ہے، اور مردہ کو زندہ سے پیدا فرماتا ہے، (یعنی بے جان دانہ سے پودوں کو نکالتا ہے پھر پھر پودوں سے بے جان دانہ نکالتا ہے)، وہ اللہ ہے (جو یہ سارے کام انجام دیتا ہے) پھر تم اوندھے منہ کدھر بھٹکے جارہے ہو۔ وہی صبح کی روشنی نکالتا ہے، اس نے رات کو پرسکون بنایا ہے، اور سورج وچاند کو حساب کے لئے پیدا کیا ہے، یہ غالب علم والے کا مقرر کردہ نظام ہے۔

اسی نے تمہارے لئے ستارے پیدا کئے تا کہ تم ان کے ذریعہ خشکی وتری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو، ہم نے ان لوگوں کے لئے نشانیاں کھول کر بیان کردی ہیں جو (حقائق) کا علم رکھتے ہیں، اسی نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پھر اسی زمین پر تمہاری جائے قرار یعنی مسکن ہے اور یہیں جائے امانت یعنی مدفن وقبر ہے)۔

ایک دوسرے موقع پر اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''**الله الذي جعل لكم الليل لتسكنوا فيه والنهار مبصرا إن الله لذو فضل على الناس ولكن أكثر الناس لا يشكرون**'' (سورۂ غافر:٦١) (اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے رات کو پیدا کیا ہے تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو، اور اسی نے دن کو روشن بنایا ہے، یقیناً اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ہیں)۔

امام ابن عاشورؒ کی وضاحت کے مطابق رات و دن کی منفعتوں سے اس دنیا اور باشندگان دنیا کے اکثر مصالح مربوط ہیں..... باشندگان عالم کی ایک مصلحت یہ ہے کہ انسان اور جانور رات میں اعصابی نشاط وسرگرمی کو موقوف کرنے کی خاطر سکون و راحت حاصل کریں؛ کیونکہ دن میں جسم وحواس کے عمل سے اعصابی نظام میں فتور وسستی آ جاتی ہے، پھر رات کی راحت کے بعد پورے جسم کے اعصابی نظام اور حواس کے اندر نشاط وچستی آ جاتی ہے''(۱)۔

اسی طرح انسان سورج کی شعاعوں اور کرنوں کی حرارت، روشنی اور نئی طاقتوں سے مستفید ہوتا ہے، نیز انسان ان ہواؤں سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے جو بادلوں کو ادھر سے ادھر لے جاتی ہیں اور لوگوں کے لئے بارش لاتی ہیں۔

فرمان باری تعالی ہے: ''**وأرسلنا الرياح لواقح فأنزلنا من السماء ماءً فأسقيناكموه وما أنتم له بخٰزنين**'' (سورۂ حجر:٢٢) (اور ہم نے ہواؤں کو پانیوں سے بھر دیا (وہ بدلی لاتی ہیں) پھر ہم نے آسمان یعنی اوپر سے پانی برسایا، پھر ہم نے پینے کے لئے تمہیں

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۲۴، ص ۱۸۴۔

پانی عطا کیا۔تم نے (پہلے سے) اسے ذخیرہ نہیں کر رکھا تھا)۔

خلاصہ کلام یہ کہ جسم کی سلامتی اور صحت وتندرستی اور عافیت ایک قرآنی اصلاحی مقصد ہے جو قرآنی آیات کے اس اہتمام سے ماخوذ ہے کہ جسم کھانے پینے اور لباس وغیرہ زندگی کی پاکیزہ چیزوں سے اپنا حصہ لے(۱)۔

اس جسم کے حامل انسان کے لئے اللہ تعالی نے اپنے تخلیق کردہ آسمان وزمین اور ان کے اندر موجود متعدد نظاموں کو مسخر کر رکھا ہے، صرف جسم کی سلامتی اور صلاحیت ہی قرآن مجید میں وارد جسمانی صلاح ودرستگی کی منفرد تصویر نہیں ہے، بلکہ اس پس منظر میں ''صلاح'' اور ''فساد'' کے مادہ کے ہمارے استقراء کے نتیجے میں دیگر صورتیں بھی موجود ہیں جو قرآنی احکام وتعلیمات اور ہدایات سے ہم آہنگ ہوکر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

۲-قرآن مجید کے ساتھ تعامل اور جسمانی عمل کی اصلاح:

قرآن مجید کے ساتھ تعامل سے میری مراد وہ قبولیت ہے، جس کے ذریعہ صحیح وسالم جسم کا حامل شخص قرآنی تعلیمات، احکامات اور مختلف قسم کی ہدایات اخذ کرتا ہے، ان کو سمجھتا ہے اور ان پر غور وفکر کرتا ہے۔اسی وجہ سے ہم اس قبولیت کے اندر اس منفی تعامل کے درمیان جو انسان کے اعضاء وجوارح کے اعمال اور سرگرمیوں میں فساد کا رنگ بھرتے ہیں، اور اس مثبت تعامل کے درمیان امتیاز کریں گے جو اعضاء وجوارح کے ارتکاب کردہ اعمال اور سرگرمیوں میں صلاح ونیکی

۱- اس پہلو کی مزید معلومات کے لئے بدن کی سلامتی کے تحفظ کے بارے میں امام غزالیؒ کی تحریر کا مطالعہ کیجئے، انہوں نے اس سلسلے میں جو نمایاں بات لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ: ''دنیا اللہ تعالی کی طرف چلنے اور روانہ ہونے کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے، اور جسم اس کی سواری ہے، جو منزل اور سواری کی تدبیر وانتظام سے غفلت برتے اس کا سفر پورا نہیں ہوگا، دنیا میں جب تک معیشت کا معاملہ منظم نہ ہو اس وقت تک سلوک یعنی اللہ عزوجل کے قرب کی سعی وکاوش اور سب سے کٹ کر اسی کی طرف قبال وتوجہ کی کیفیت بھی حاصل نہیں ہوگی، سلوک کی راہ مکمل طور پر اسی وقت طے ہوگی جبکہ بدن صحیح وسالم وتندرست رہے اور نسل میں دوام ہو، یہ دونوں چیزیں اسی وقت پوری ہوں گی جبکہ ان دونوں کے وجود کے تحفظ کے ذرائع اختیار کئے جائیں اور ان دونوں کو تباہ وبرباد کرنے والے اسباب کا ازالہ کیا جائے''، دیکھئے: غزالی، ابوحامد محمد بن محمد ''جواہر القرآن''، تحقیق: شیخ محمد رشید رضا قبانی، بیروت، دار احیاء العلوم، ط: ۲ (۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء)، ص: ۳۲۔

کا رنگ بھرتے ہیں۔

الف-جسمانی صلاح ودرستگی اور منفی (Negative) تعامل:

قرآن مجید کی تعلیمات و ہدایات کے ساتھ منفی تعامل قرآنی تعلیمات، احکامات اور ہدایات کی تعمیل نہ کرنے کی قسموں اور درجات میں سے ایک قسم اور درجہ ہے، جس کی بنا پر متعدد ممنوعہ سرگرمیوں میں فساد وبگاڑ عیاں ہوتا ہے۔ ایک صورت: دین کو بدل دینا ہے، اس کی دلیل: عاصم اور ابوجعفر کی روایت سے منقول نافع، ابوعمر اور ابوبکر کی قراءت ہے، فرمان باری تعالی ہے:''**إنی أخاف أن یبدل دینکم أو أن یظهر في الأرض الفساد**''(سورۂ غافر:۲۶) (مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے یا زمین میں فساد برپا کردے)۔ان سب کی قراءت میں''یظہر''(ظاہر کردے) کی یاء پر ضمہ ہے، اور''الفساد'' کی دال پر فتحہ ہے۔یعنی تمہارے دین کو بدل دے اور یہ تبدیلی''فساد وبگاڑ'' کے ظاہر ہونے کا سبب بن جائے۔

ایک دوسری صورت: معصیت اور حالات میں خلل پذیری ہے۔جیسا کہ اس فرمان باری تعالی میں مذکور ہے، جس کا خطاب نبی کریم ﷺ کے صحابہ سے ہے:''**فلولا کان من القرون من قبلکم أولوا بقیة ینهون عن الفساد في الأرض إلا قلیلا ممن أنجینا منهم**''(سورۂ ہود:۱۱۶)(تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں میں غیرت وشعور کے حامل افراد کیوں نہیں ہوئے جو روئے زمین میں فساد سے روکتے، ہاں، برائے نام چند اشخاص تھے جن کو ان میں سے ہم نے نجات دی)۔

ایک تیسری صورت قرآن کریم کو جھٹلانے کی ہے، جیسا کہ اس بیان ارشاد الٰہی میں ہے:''**ومنهم من یؤمن به ومنهم من لا یؤمن به وربک أعلم بالمفسدین**''(سورۂ یونس:۴۰)(ان میں سے بعض اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض اس پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، اور تیرا رب بگاڑ پیدا کرنے والوں کو خوب جانتا ہے)، یعنی اس جگہ کچھ لوگ قرآن کریم اور اس کے اللہ کے نزدیک سے ہونے پر ایمان رکھتے تھے، لیکن اس ایمان کی تعبیر سے انہیں عداوت

ودشمنی اور جان بوجھ کر انکار کی عادت باز رکھتی تھی، اس لئے وہ ایمان کو اپنے سینہ اور دل میں ہی چھپائے رکھتے تھے۔ لوگوں میں سے بعض افراد ایسے بھی تھے جو اپنے سرغنوں اور لیڈروں کی پیروی اور تقلید میں اس قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

امام ابن عاشورؒ رقم طراز ہیں: ''علماء معانی میں سے محققین کی رائے کے مطابق کلام کے اخیر میں ''**وربک أعلم بالمفسدین**''(اور تیرا رب فساد مچانے والوں کو خوب جانتا ہے)، جملہ معترضہ ہے، اس میں وعید و دھمکی اور انذار و تخویف کی طرف اشارہ ہے، نیز اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی فساد پھیلانے والوں میں سے ہیں؛ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ اس جگہ فساد پھیلانے والوں کا ذکر اسی وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ لوگ بھی انہیں میں سے ہیں، ورنہ ''مفسدین'' کے بیان میں کوئی مناسبت نہیں ہوگی، لہذا مفہوم یہ ہے کہ تیرے رب کو خوب علم ہے، ان فساد مچانے والوں کا جن کے زمرہ میں یہ لوگ بھی داخل ہیں''(۱)۔

چوتھی صورت: مذموم اختلاف اور اتحاد و اتفاق کا نہ ہونا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل اسلام اہل کفر کا سامنا اور مقابلہ کرنے کے سلسلے میں متحد نہیں ہوں گے تو ان کی شان و شوکت ظاہر نہیں ہوگی، اور نہ ہی کسی رائے پر ان کا اتفاق ہو سکے گا، اسی کو'' قرآن مجید'' نے'' بڑے فساد'' سے موسوم کیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:''**إلا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد كبير**''(سورۂ انفال:۷۳)(اگر تم ایسا نہیں کروگے تو روئے زمین پر فتنہ اور'' بڑا فساد'' مچے گا)۔

پانچویں صورت: مال کو ضائع کرنا اور چوری کرنا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**والسارق والسارقة فاقطعوا أيديهما جزاء بما كسبا نكالا من ا لله والله عزيز حكيم، فمن تاب من بعد ظلمه وأصلح فإن الله يتوب عليه إن الله غفور رحيم**''(سورۂ مائدہ:۳۸-۳۹)(چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ ان کے کرتوتوں کے بدلہ کاٹ دو، یہ اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا ہے، اور اللہ غالب اور حکمت

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۱۱، ص:۱۷۵۔

والا ہے، جو اپنے ظلم کے بعد توبہ کرلے اور اپنے حالات درست کرلے، تو اللہ تعالی اسکی توبہ قبول فرمائے گا، یقیناً اللہ تعالی بخشنے والا مہربان ہے)۔

چھٹی صورت: ناحق کسی انسانی جان کا قتل ہے، فرمان باری تعالی ہے: "**من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعا ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**" (سورۂ مائدہ: ۳۲) (جو کسی انسانی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو، مار ڈالے، تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی انسانی جان کو بچالیا (اسکی زندگی کے تحفظ کا انتظام کیا) تو اس نے گویا تمام لوگوں کی زندگی بچالی (ان کی زندگی کا تحفظ کیا)۔

ساتویں صورت: جاسوسی ہے جس کا دشمن دشمن کے حق میں قصد کرتا ہے، سورۂ یوسف کے اندر یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے بارے میں اسی کی نفی کی ہے، فرمان باری تعالی ہے: "**قالوا تالله لقد علمتم ما جئنا لنفسد في الأرض وما كنا سارقين**" (سورۂ یوسف: ۷۳) (انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم زمین میں فساد مچانے کے لئے نہیں آئے ہیں، اور نہ ہی ہم چور ہیں)۔

آٹھویں صورت: قطع رحمی ہے؛ کیونکہ اللہ تعالی نے زمین میں فساد مچانے کے ساتھ اسے ملایا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "**ويقطعون ما أمر الله به أن يوصل ويفسدون في الأرض**" (سورۂ رعد: ۲۵) (اور یہ لوگ ان رشتوں کو توڑتے ہیں، جن کو جوڑنے کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں)۔

نویں صورت: یہ ہے کہ جسمانی بگاڑ ناحق جان مارنے کے ساتھ مربوط ہے، فرمان باری تعالی ہے: "**من أجل ذلك كتبنا على بني إسرائيل أنه من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قال الناس جميعا**" (سورۂ مائدہ: ۳۲) (اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لازم قرار دیا تھا کہ جو کسی جان کو جان کے بدلہ، یا زمین میں فساد پھیلانے کے

بغیر قتل کرے، گویا اس نے تمام لوگوں کو مار ڈالا (ایک قتل متعدد قتل کا سبب بن جاتا ہے، اور انسانی جانیں ضائع ہوجاتی ہیں)۔

چنانچہ زمین میں فساد پھیلانا ناحق کسی جان کو قتل کردینے کے ساتھ مربوط ہے، اس لئے کہ کسی جان کی ہلاکت میں تمام لوگوں افراد اور جماعتوں کے امن وسکون کے درہم برہم ہونے کا خطرہ ہے۔

اسی طرح فساد ڈکیتی اور رہزنی سے بھی مربوط ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "**إنما جزاؤ الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الأرض فسادا أن يقتلوا .....**" (سورۂ مائدہ:۳۳) (ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، یہ ہے کہ ان کو قتل کردیا جائے.....)۔

دسویں صورت: منافقین کا نفاق ہے جو زمین میں فساد مچاتے ہیں اور ان کو اپنے فساد پھیلانے کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے، ارشاد الٰہی ہے: "**وإذا قيل لهم لا تفسدوا في الأرض قالوآ إنما نحن مصلحون، ألا إنهم هم المفسدون ولكن لا يشعرون**" (سورۂ بقرہ:۱۱-۱۱) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے: زمین میں فساد مت مچاؤ تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں، خبردار! یہی لوگ فساد پھیلانے والے ہیں، لیکن انہیں احساس نہیں ہے)۔ چنانچہ منافقین وہ انسان ہیں جو ڈبل فساد کا ارتکاب کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ دھوکہ اور کذب بیانی کے اسلوب پر ہی اکتفا نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ مزید برآں سفاہت وحماقت اور فخر وغرور اور اپنے موقف کو جواز فراہم کرنے کے دعوی کے اسلوب بھی اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح نفاق دو طرح کے فساد کی انجام دہی سے مربوط ہے، منافقین ایک فساد زمین میں انجام دیتے ہیں، جس کا لوگ مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور دوسرا فساد نعروں اور ہتافات کے ذریعہ انجام دیتے ہیں، جسے اہل علم سمجھ لیتے ہیں، چونکہ منافقین اپنے باطن کے اعتبار سے اللہ تعالی کے لئے مخلص نہیں ہوتے ہیں، اس لئے ان پر اپنے اعمال کے فساد کا احساس دشوار ہوتا ہے؛ کیونکہ ان کے نزدیک

صلاح وفساد کا پیمانہ ذاتی خواہشات سے ماخوذ ہے، اور موضوعی پیمانے پر مبنی نہیں ہے، ان کو موضوعی پیمانہ کی ضرورت ہے، جس کے ذریعہ صلاح وفساد کا علم ہو، اسی لئے قرآن نے ان کے حق میں فیصلہ کن اور سچا تبصرہ سنایا ہے: ''ألا إنهم هم المفسدون ولكن لايشعرون'' (سورۂ بقرہ: ۱۲) (خبردار! وہی فساد مچانے والے ہیں، لیکن انہیں احساس نہیں ہے)۔

بہرحال انسان اپنے جسمانی، عقلی اور لسانی ساخت کے پیش نظر، جس سے وہ مرکب ہے، ایک ایسی مخلوق ہے جس میں صلاح ونیکی انجام دینے کی استعداد ہے، نیز اس کے اندر فساد کے ارتکاب کی بھی اہلیت ہے، اس کی دلیل فرشتوں کی زبانی فرمان باری تعالی ہے: ''أتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك'' (سورۂ بقرہ: ۳۰) (کیا آپ زمین میں ایسے لوگوں کو مقرر کریں گے جو وہاں فساد مچائیں گے اور خونریزیاں کریں گے، حالانکہ ہم آپ کی تحمید وتسبیح کرتے ہیں اور آپ کی تقدیس اور ہر نقص وعیب سے پاک ہونے کو بیان کرتے ہیں)۔

یہ بات معلوم ہے کہ یہ مخلوق ذاتی صلاحیتوں سے مرکب ہے، جن کی بنا پر وہ جبلت وفطرت سے نکل کر معصیت میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ بعض مفسرین نے اسے نوٹ کیا ہے کہ آیت میں مضارع کی تعبیر وارد ہے جو دوام وہمیشگی کی بجائے تجدد وحدوث (وجود میں آکر ختم ہوجانے) کو بتاتی ہے، یعنی اس سے کبھی کبھی فساد وخونریزی وجود میں آتی ہے، اس لئے کہ انسان کی طرف سے مسلسل فساد وخونریزی نہیں ہوتی ہے(۱)۔

ب- جسمانی صلاح اور مثبت تعامل:

مثبت تعامل قرآنی احکام تعلیمات اور ہدایات پر عمل کی طرف سبقت اور پیش قدمی کرنے کی ایک قسم اور درجہ ہے(۲)۔

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۱، ص: ۴۰۴۔

۲- ''ایجابیہ'' مصدر صناعی ہے جو قرآن مجید کے احکام وتعلیمات کے ساتھ تعامل وہم آہنگی کے ایک درجہ اور

یہی وجہ ہے کہ قرآنی خطاب میں ''صلاح'' توبہ سے مربوط ہے؛ اس لئے کہ سچی توبہ اصلاح کی انجام دہی سے ماخوذ ہے۔ ایک عالم کے لحاظ سے سچی توبہ کی علامت یہ ہے کہ اس کی صلاح کی جلوہ گری اس کے بیان اور حق کے نہ چھپانے میں ہو۔ میری مراد یہ ہے کہ عالم کی توبہ دو شکلوں میں نمایاں ہوتی ہے:

پہلی شکل یہ ہے کہ وہ حق کو نہ چھپائے اور لوگوں سے درست بات موقوف نہ کرے اور صحیح بات کو اپنی ذات میں ہی محدود نہ کرلے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ اپنے اصلاحی افکار وخیالات کی آزادانہ تعبیر کی ذمہ داری سنبھالنے کی اسے قدرت ہو، فرمان باری تعالی ہے:''**إن الذين يكتمون ما أنزلنا من البينات والهدى من بعد ما بينه للناس فى الكتاب أولائک يلعنهم الله ويلعنهم اللّٰعنون، إلا الذين تابوا وأصلحوا وبينوا فأولائک أتوب عليهم وأنا التواب**

قسم کو بتاتا ہے، ہم بولتے ہیں: '' أجاب'' (اس نے قبول کیا)، ''یجیب'' (وہ قبول کرتا ہے) اور ''یستجیب'' (وہ جواب دیتا ہے، قبول کرتا ہے)، ارشاد الٰہی ہے:''**استجيبوا لربكم من قبل أن يأتي يوم لامردله من الله**'' (سورۂ شوری:۴۷) (اپنے رب کے فرمان کو قبول کرو، قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایسا دن آجائے جسے کوئی ٹال نہیں سکتا ہے)، نیز فرمان باری تعالی ہے:''**يأيها الذين آمنوا استجيبوا لله وللرسول إذا دعاكم لما يحييكم**'' (سورۂ انفال:۲۴) (اے ایمان والو! اللہ اور رسول جب زندگی بخش فرمودات کی طرف بلائیں تو ان کی پکار پر لبیک کہو)، ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:''**يا قومنا أجيبوا داعي الله**'' (سورۂ احقاف:۳۱) (اے ہماری قوم! اللہ کے داعی کی آواز پر لبیک کہو)، فعل '' أجاب'' (اس نے جواب دیا) کا مصدر ''اجابۃ'' ہے، اسی طرح ہم ''مجیب'' (جواب دینے والا) بولتے ہیں، جو اللہ تعالی کے اچھے ناموں میں سے ایک ہے، یہ حقیقت ہمیں فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ قرآن مجید مثبت تعامل کے مطالبہ اور تعامل کرنے والوں کی تعریف سے بھرا ہوا ہے، اس لئے کہ یہ لوگ نیکیوں کی طرف لپکتے تھے، مثال کے طور پر: اللہ تعالی ابراہیم، داؤد، سلیمان، لوط، اسحاق، یعقوب، نوح، ایوب، اسماعیل، ادریس، ذوالکفل، یونس، زکریا اور یحیی علی نبینا وعلیہم السلام کے واقعات کو بیان کرنے کے بعد ان کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے:''**إنهم كانوا يسارعون في الخيرات ويدعوننا رغباورهبا، وكانوا لنا خاشعين**'' (سورۂ انبیاء:۹۰) (یہ لوگ نیکیوں کی طرف لپکتے تھے اور ہمیں خوف ورغبت سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے جھکتے تھے)، خیرات ''مصالح'' کا نام ہے، جن کی ضد ''شرور وبرائیاں'' ہیں، جو کہ مفاسد ہیں۔

الرحیم"(سورۂ بقرہ:۱۵۹-۱۶۰)(یقیناً جو لوگ ہمارے نازل کردہ واضح دلائل اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، بعداس کے کہ ہم نے لوگوں کے لئے کتاب میں ان کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے، ان پر اللہ لعنت فرماتا ہے اور لعنت کرنے والے (فرشتے اور حق پرست لوگ بھی) لعنت کرتے ہیں، سوائے ان کے جنہوں نے توبہ کر لی اور اپنے حالات سدھار لئے اور حق کو بیان کر دیا، تو ایسے لوگوں کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے، اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہوں)۔

اسی طرح اصلاح بھی توبہ سے مربوط ہے، اس لئے کہ توبہ کی سچائی دو قسم کے انتقال میں ظاہر ہوتی ہے، پہلی قسم یہ ہے کہ انکار و کفر کے مرحلہ سے منتقل ہو کر اقرار و ایمان کے مرحلہ میں پہنچ جائے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:"**كيف يهدي الله قوما كفروا بعد إيمانهم وشهدوا أن الرسول حق وجاء هم البينات والله لا يهدي القوم الظالمين، أولئک جزاؤهم أن عليهم لعنة الله والملائكة والناس أجمعين، خالدين فيها لا يخفف عنهم العذاب ولا هم ينظرون، إلا الذين تابوا من بعد ذلک وأصلحوا فإن الله غفور رحيم**"(سورۂ آل عمران:۸۶-۸۷)(اللہ تعالی ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے سکتا ہے جو ایمان لانے، رسول کے سچے ہونے کی گواہی دینے اور واضح دلائل آ جانے کے بعد کفر میں مبتلا ہو گئے، حالانکہ اللہ تعالی ظالم لوگوں کو ہدایت سے نہیں نوازتا ہے، یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے، ان کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی، نہ ہی ان کو مہلت ملے گی، سوائے ان کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنے حالات درست کر لئے، تو یقیناً اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے)۔

دوسری قسم غلط بیانی اور افواہ پھیلانے کے مرحلہ سے منتقل ہو کر اصلاح کے مرحلہ میں آ جانا ہے، فرمان باری تعالی ہے:"**إن المنافقين في الدرک الأسفل من النار ولن تجدلهم نصيراً، إلا الذين تابوا وأصلحوا واعتصموا بالله وأخلصوا دينهم لله**

فأولئک مع المؤمنین وسوف یؤت الله المؤمنین أجرا عظیما''(سورۂ نساء:۱۴۵-۱۴۶)(یقیناً منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے،اور آپ ان کے لئے کوئی معاون ومددگار نہیں پائیں گے، سوائے ان کے جنہوں نے توبہ کرلی، اور اپنے حالات درست کرلئے،اللہ کو مضبوطی سے تھام لیا،اور اللہ کے لئے اپنے دین واطاعت کو خالص کرلیا،تو ایسے لوگ اہل ایمان کے ساتھ ہوں گے،اور عنقریب اللہ اہل ایمان کو بڑے اجر سے نوازے گا)۔

یقیناً حاکم کے لحاظ سے سچی توبہ کی علامت ونشانی یہ ہے کہ ظلم سے باز آ کر اصلاح کو انجام دے،اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''**فمن تاب من بعد ظلمه وأصلح فإن الله یتوب علیه إن الله غفور رحیم**''(سورۂ مائدہ:۳۹)(جوظلم کرنے کے بعد توبہ کرلے اور اپنے حالات درست کرلے تو اللہ تعالی اس کی توبہ قبول فرمائے گا،یقیناً اللہ تعالی بخشنے والا اور مہربان ہے)۔

صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ظالم ظلم کے ارتکاب سے باز آجائے،یہ تو محض منفی طور پر باز رہنا ہے،یہ بھی مطلوب ہے،لیکن اس سے زیادہ مطلوب یہ ہے کہ مثبت سطح کی طرف ترقی ہو، جس کے ذریعہ توبہ کرنے والا حاکم خیر وصلاح کے مراتب کی طرف عروج کرے،استاذ سید قطبؒ کی نگاہ میں اس کی دلیل یہ ہے کہ'' انسانی نفس کو لازماً متحرک وسرگرم ہونا چاہئے،اگر وہ شر وفساد سے باز آجائے اور خیر وصلاح کی طرف سرگرم نہ ہو،تو اس کے اندر خلا باقی رہتا ہے اور کمزوری رہ جاتی ہے،جو انسانی نفس کے شر وفساد کی طرف پلٹنے کا سبب بن جاتے ہیں،لیکن انسانی نفس اگر خیر وصلاح کی طرف سرگرم ہو تو پھر اس مثبت پہلو اور روحانیت سے پر ہونے کی وجہ سے وہ شر وفساد کی طرف پلٹنے سے محفوظ رہتا ہے(۱)۔

اسی طرح اصلاح اس بات سے مربوط ہے کہ اس کی طرف بالقصد توجہ ہو؛ کیونکہ وہ قلبی یا باطنی اعمال میں سے ایک عمل ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:''**إن أرید إلا الإصلاح ما استطعت**''(سورۂ ہود:۸۸)(میں تو بس بھر اصلاح چاہتا ہوں)، نیز حکمین اور میاں بیوی کے

۱- قطب،فی ظلال القرآن،مرجع سابق،ج۲،ص۸۸۰۔

بارے میں فرمان باری تعالی ہے:''**وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدأ إصلاحا يوفق الله بينهما**''(سورۂ نساء:۳۵)(اگر میاں بیوی کے درمیان شدید نزاع کا اندیشہ ہوتو ایک حکم وثالث شوہر کے خاندان سے اور ایک حکم وثالث عورت کے خاندان سے بھیج دو، اگر میاں بیوی اصلاح کے خواہش مند ہوں گے (اور حکمین بھی دل سے اصلاح چاہیں گے)تو اللہ تعالی دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا)۔

اگر لوگوں کے درمیان باہم ظلم وزیادتی اور جھگڑے ہوں تو ان کے بگڑے ہوئے تعلقات کو درست کرنا ضروری ہے، یہ صورت مثال کے طور پر اس وقت پیش آئی جب مال غنیمت کے سلسلے میں مسلمانوں کا اختلاف ہوا، اور اس بارے میں ان کے اخلاق میں خرابی پیدا ہوئی، تب فرمان الہی نازل ہوا:''**يسئلونک عن الأنفال قل الأنفال لله والرسول فاتقوا الله وأصلحوا ذات بينكم**''(سورۂ انفال:۱)(یہ لوگ آپ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، آپ کہہ دیجئے مال غنیمت اللہ اور رسول کے لئے ہیں، لہذا اللہ سے ڈرتے رہو، اور آپ کے ساتھ تعلقات درست رکھو)(۱)۔

نیز فرمان الہی ہے:''**لا خير في كثير من نجواهم إلا من أمر بصدقة أو معروف أو إصلاح بين الناس**''(سورۂ نساء:۱۱۴)(لوگوں کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر وبھلائی نہیں، مگر جو شخص صدقہ کا حکم دے، یا بھلائی کا حکم دے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم

۱- ''نفل'' وہ عطیہ ہے جو مال غنیمت کے حصہ سے زائد بعض قتال کرنے والے مجاہدین کو دیا جاتا ہے، اس کا مقصد مزید حسن کارکردگی پر ان کو آمادہ اور برانگیختہ کرنا ہوتا ہے، حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے مروی ہے کہ میں نے ''انفال'' کے بارے میں عبادہ بن صامتؓ سے دریافت کیا، تو انہوں نے جواب دیا: ''یہ آیت ہم شرکاء بدر کے گروہ کے بارے میں نازل ہوئی، جب ''نفل'' (مال غنیمت) کے بارے میں ہمارا اختلاف ہوا، اور اس کے بارے میں ہمارے اخلاق میں خرابی پیدا ہوئی، تو اللہ نے اسے ہمارے ہاتھ سے چھین لیا، اور اس کا اختیار رسول کریم ﷺ کو سپرد کردیا، رسول کریم ﷺ نے اسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کردیا.....اس طریقہ میں اللہ تعالی کا تقوی اور رسول کریم ﷺ کی اطاعت ملحوظ رہی، نیز آپس کے تعلقات درست رہے، دیکھئے: طبری، ''جامع البیان عن تأویل آي القرآن''، مرجع سابق، ج۱۱، ص: ۱۴-۱۵۔

دے (تو ایسے شخص کی سرگوشی میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

اس مظہر کی مثالوں میں سے دو باہم لڑنے والے گروہوں کے درمیان اصلاح کرنا بھی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''**وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما فإن بغت إحدهما على الأخرى فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله، فإن فآ ء ت فأصلحوا بينهما بالعدل وأقسطوا إن الله يحب المقسطين، إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم**'' (سورۂ حجرات:۹-۱۰) (اگر اہل ایمان کے دو گروہ باہم لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کرادو، پھر اگر ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کر بیٹھے تو زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو، یہاں تک کہ زیادتی کرنے والا گروہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، سو اگر وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ اصلاح کرادو۔ اور انصاف کرو، یقیناً اللہ تعالی انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اہل ایمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، اس لئے اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح کرادو)۔

خلاصہ کلام یہ کہ جسمانی عمل کی اصلاح میں دوہرا تدافع ہے، ایک طرف اس میں فساد اور جسم کو لاحق ہونے والے مرض کے اسباب کا جسمانی سلامتی کے اسباب کی تحصیل کے ذریعہ ازالہ ہے، تو دوسری طرف اس میں قرآن کے عملی احکامات اور تعلیمات کے ساتھ مثبت تعامل اور ہم آہنگی ہے۔

مبحث سوم
تدبیری عمل

انسان نے جس خلافت کی ذمہ داری اٹھائی ہے اس کے فرائض کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زمین کے اندر اپنی زندگی کی ذمہ داری کا انتظام اور تدبیر کرے، مطلوب یہ ہے کہ یہ تدبیر وانتظام درست ہو، اور فاسد تدبیر وانتظام نہ ہو، جیسا کہ فرشتوں کا ظن وگمان یہی تھا کہ یہ فاسد تدبیر وانتظام کریں گے۔ ارشاد الٰہی ہے: ''**وإذ قال ربک للملائکة إني جاعل في الأرض خلیفة قالو آ أتجعل فیها من یفسد فیها ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک قال: إني أعلم مالاتعلمون**''(سورۂ بقرہ:۳۰)(اس وقت کو یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں خلیفہ مقرر کروں گا۔ فرشتوں نے کہا: کیا آپ اس میں ایسے لوگوں کو مقرر کریں گے جو اس میں فساد مچائیں گے اور خونریزیاں کریں گے، حالانکہ ہم تیری تسبیح وتحمید کرتے ہیں اور تیری تقدیس اور ہر نقص سے عیب سے پاکی بیان کرتے ہیں، اللہ تعالی نے فرمایا: میں وہ چیز جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو)۔

یہ امر مخفی نہیں ہے کہ انسان مدنی الطبع (یعنی سماجی جانور) (Social Animal) ہے، اجتماعیت اور سماج کے ساتھ رہنا چاہتا ہے، جیسا کہ سماجیات کے ماہرین کہتے ہیں، وہ اپنے ہم جنس افراد کے ساتھ باہمی دلجوئی اور مزاح کے مختلف طریقوں اور محاسبہ اور باہمی گفتگو اور بات چیت کی متعدد قسموں کے ساتھ رابطہ میں رہتا ہے، اسی طرح وہ سماجی مخلوق ہے جیسے دوسرے کی ضرورت ہے، چنانچہ وہ ان کے ساتھ معاہدہ اور باہمی التزام کی متعدد صورتوں میں داخل ہوتا ہے، یہ التزام ومعاہدے اکثر حالات میں باہمی تدافع، باہمی تنازعہ اور جھگڑے

سے خالی نہیں ہوتے ہیں، اس بنا پر ہم اس مقصود کو سمجھ سکتے ہیں کہ زیادہ تر قرآنی خطاب کا رخ فرد کی طرف ہے، اس حیثیت سے کہ وہ کل اور مجموعہ کا ایک حصہ ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''**إن الله يأمركم أن تؤدوا لأمانات إلى أهلها**'' (سورۂ نساء:۵۸) (یقیناً اللہ تعالی تمہیں حکم دیتا ہے کہ مستحقین کو امانتیں ادا کرو)، نیز فرمان باری تعالی ہے: ''**إنما المؤمنون إخوة**'' (سورۂ حجرات:۱۰) (اہل ایمان تو بس آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔

اسی طرح ہم اس سماجی اور باہمی رابطے کی حقیقت کے مدنظر اس مقصد کو سمجھ سکتے ہیں جو فرد کی طرف اکثر قرآنی خطاب کے متوجہ ہونے سے مقصود ہے، اس حیثیت سے کہ فرد جماعت سے نسبت رکھنے والا ہے، جیسا کہ مجموعی اعتبار سے قرآنی خطابات کا یہی حال ہے۔ جیسے فرمان باری تعالی ہے: ''**يأيها الذين آمنوا**'' (اے ایمان والو!)، ''**يأيها الناس**'' (اے لوگو!)، ''**يبني آدم**'' (اے آدم کی اولاد!)، قرآنی خطاب کا مقصد یہ ہے کہ اس سماجی حقیقت کے سلسلے میں فرد کی تدبیر، سماج اور قوم کی تدبیر وانتظام حکم الٰہی کی پیروی میں درست ہو، فرمان باری تعالی ہے: ''**ولا تفسدوا في الأرض بعد إصلاحها**'' (سورۂ اعراف:۵۶) (اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت مچاؤ)، نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**ولا تعثوا في الأرض مفسدين**'' (سورۂ بقرہ:۶۰) (زمین میں فساد انگیزی کرتے مت پھرو)۔

ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ فرد، سماج اور قوم کے جسمانی عمل کی اصلاح کے لئے متعدد عملی احکام وارد ہیں، یہ وہ احکام ہیں جن کو فقہاء اور اصولیین اصطلاح میں پانچ شرعی احکام: وجوب، ندب واستحباب، حرمت، کراہت اور اباحت سے موسوم کرتے ہیں، یہ ایسے احکام ہیں، جن کے بغیر اسلامی سماج کی حالت درست نہیں ہوسکتی ہے۔ ہاں، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن اس طرح جس طرح امام ابن عاشورؒ نے بیان کیا ہے: ''کمی بیشی کو قبول کرنے والے امور میں کمی وبیشی کے لحاظ سے صلاح کے مراتب مختلف ہیں، چنانچہ نیک وصالح آدمی کم فضیلت والی چیزوں میں کمی کرتا ہے تاکہ زیادہ فضیلت والی اشیاء کی فراہمی کے لئے

فارغ ہوجائے۔جبکہ غیر صالح آدمی کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے،فرائض وواجبات اورمحرمات کا درجہ کمی وبیشی کوقبول نہیں کرتا ہے،اس لئے کہ فرائض وواجبات میں کمی اورمحرمات میں زیادتی معصیت ہے''(۱)۔خاندانی، مالیاتی، سیاسی اور جرائم سے متعلق زندگی کے میدان میں سماجی زندگی کی انسانی تدبیر جن تشریعی احکام اورقرآنی مقاصد کی بنیاد پر درست ہوتی ہے(۲)،چونکہ ان کا استقراء باعث طوالت ہے، اس لئے ہم نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ''صلاح'' اور''فساد'' کا مادہ جن حقائق پر مشتمل ہیں،ہم اپنی توجہ اسی پر مرکوز کریں۔اس پس منظر میں ہم نے اس بات کونوٹ کیا ہے کہ تدبیری عمل بہ حیثیت صلاح یا فساد اقتدار اوراس کے مختلف انتظامات اورتدابیر کا اختیار رکھنے والے کے درمیان اوراصلاحی عمل کے تقاضا یعنی تعمیر وترقی کے انتظامات اورتدابیر کے درمیان''تدافع'' پر مبنی ہے۔

۱-فاسد تدبیری عمل:

تدبیر کا فساد دوصورتوں میں نمایاں ہے۔پہلی صورت:عسکری وفوجی ہے، دوسری صورت:سماجی ہے،فوجی صورت کی نمایاں شکل وہ ہے جو بادشاہ حضرات دوسرے ملک پر فوجی تسلط حاصل کرنے کے وقت اختیار کرتے ہیں،قرآن کریم میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:''**قالت :إن الملوک إذا دخلوا قریة أفسدوها وجعلوا أعزة أهلها أذلة وکذلک یفعلون**''(سورۂ نمل:۳۴)(ملکہ سبا نے کہا:یقیناً بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ وبرباد کردیتے ہیں، اور وہاں کے عزت دار باشندگان کو ذلیل کرکے رکھ دیتے ہیں اوروہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے)۔

ملکہ سبا نے جب سلیمان علیہ السلام کا خط پایا،اوران خطرات کو سمجھ لیا جو اس کی قوم کو

۱- ابن عاشور،اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام،مرجع سابق،ص:۷۷۔

۲- اس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے دیکھئے:رضا،الوحی المحمدی،مرجع سابق۔حامدی،مقاصد القرآن من تشریع الأحکام،مرجع سابق،بالخصوص کتاب کا دوسرا اور تیسرا باب۔

لاحق ہو سکتے ہیں تو اس نے اپنے درباریوں کو قیمتی نصیحت کی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: بادشاہ یا حکمراں لوگ جب بذریعہ قتال اور غلبہ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے چھوڑ دیتے ہیں، اس طرح کہ وہاں کے باشندگان کو ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں، وہاں کی قیادت، معززین اور سربرآوردہ لوگوں کو رسوا و خوار کرتے ہیں، اس وقت وہ ذلیل و خوار اور بے بس نظر آتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر: فوجی غلبہ قوت کے قدیم عناصر کو تباہ و برباد کرنے اور قدیم نظام کے قائدین کو ذلیل و خوار کرنے کے ساتھ مربوط ہے(۱)۔

اسی طرح یہ تسلط حاصل کرنے والے حکمراں نظام کو بدلنے میں پہل کرتے ہیں تا کہ وہ ان کے مصالح اور خواہشات سے ہم آہنگ ہو جائے۔

امام ابن عاشورؒ نے اس مظہر کے سلسلے میں انسانیت کے گذشتہ ادوار میں رونما ہونے والے واقعات اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات کے درمیان خط امتیاز کھینچا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ ''جب وہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں''، یہ ماضی کی تاریخ کے شواہد سے استدلال ہے، اس لئے ''اذا'' اس محل کے قرینہ کی وجہ ماضی کے لئے ظرف ہے.....اور جملہ: ''وہ ایسا ہی کریں گے'' بہ طور استصحاب ماضی کے حکم کے ذریعہ مستقبل پر استدلال ہے، یہ فرمان باری تعالیٰ: ''جب وہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں''، میں مذکور دلیل کے نتیجہ کی حیثیت رکھتا ہے''(۲)۔

سماجی صورت کے درج ذیل مظاہر ہیں:

۱- زمخشریؒ تحریر فرماتے ہیں: ''زمین میں فساد مچانے والے اس آیت کو اپنے لئے حجت بنا سکتے ہیں، حالانکہ جو حرام کو مباح ٹھہرائے وہ کافر ہے، پھر جب تحریف کے طور پر قرآن کریم سے اپنے لئے استدلال کرے، تو اس نے دو کفر کو جمع کر لیا، دیکھئے: زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الأقاویل في وجوہ التأویل، مرجع سابق، ج ۴، ص: ۴۵۳۔

۲- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۱۹، ص: ۲۶۳۔

الف- ماحولیاتی فساد و بگاڑ:

ماحولیاتی فساد کی نمایاں صورت وہ ہے جسے قرآن کریم خشکی و تری کے فساد کے طور پر پیش کرتا ہے، فرمان باری تعالی ہے: ''**ظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت أيدي الناس ليذيقهم بعض الذي عملوا**'' (سورۂ روم:۴۱) (لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے خشکی و تری میں فساد پھیل گیا تا کہ ان کو ان کے بعض کرتوتوں کا مزہ چکھائے)۔

خشکی و تری میں ظاہر ہونے والے مظاہر فساد کے تعین کے سلسلہ میں مفسرین کے اقوال میں اختلاف ہے، جیسے: کشتیوں کو غاصبانہ طور پر لے لینا، قحط وخشک سالی، زراعت وکاشتکاری میں پیداوار کی کمی، موت کی کثرت اور برکتوں کا اٹھ جانا اور ختم ہوجانا، وغیرہ(۱)۔ بلکہ یہ اقوال جیسا کہ استاذ عزہ دروزہ نے نوٹ کیا ہے۔ غرابت وندرت کی حد تک پہنچ گئے ہیں، جیسے: ہابیل کے قتل کا قول، سمندر کے پانی کا شیریں ومیٹھا ہونے کے بعد کھارا ونمکین ہوجانے جیسے دیگر اقوال(۲)۔

درحقیقت فساد کی تعریف جنس کی تعریف ہے، جس میں زمین میں برپا ہونے والا ہر فساد شامل ہے، خواہ اس کا تعلق مٹی سے ہو یا ہوا سے ہو، یا پانی سے ہو، یا نہر سے ہو یا جو وفضا سے ہو..... یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جغرافیائی حیثیتوں اور زمانی احوال کے اختلاف کے باوجود ان کا تحفظ اور ان کی صلاحیتوں پر توجہ دینا فرد اور سماجی ماحول پر واجب ہے(۳)۔

۱- اس کی مزید معلومات کے لئے دیکھئے: زمخشری، ''الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الأقاویل في وجوہ التأویل، مرجع سابق، ج۴،ص:۵۸۲، ابن عطیہ اندلسی، ''المحرر الوجیز في تفسیر الکتاب العزیز''، مرجع سابق، ج۴،ص:۲۴۰، اور اس کے بعد کے صفحات۔

۲- دروزہ، ''التفسیر الحدیث ترتیب السور حسب النزول''، مرجع سابق، ج۵،ص:۴۵۵۔

۳- (اس ہمہ گیر طریقہ پر ہم زراعت وکاشتکاری کے اس شدید اہتمام کو سمجھ سکتے ہیں جو سنت نبویہ میں وارد ہے، نیز جگہ اور پانی کی پاکی اور عدم آلودگی اور حیوانی ذخیرہ کے تحفظ کا جو زبردست اہتمام احادیث مبارکہ میں وارد ہے، اسے بھی سمجھ سکتے ہیں، اس سلسلے میں منقولہ نصوص یوں ہیں: ''جو مسلمان کوئی بھی پودہ لگاتا ہے یا کاشت کرتا ہے، پھر اس سے پرندہ، یا انسان یا چوپایہ کھالیتا ہے، یہ اس کے حق میں باعث صدقہ یعنی اجر وثواب ہوجاتا ہے''، دیکھئے: بخاری، صحیح

فرمان باری تعالی:''بما كسبت أيدي الناس''(لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے) اس میں'' باء'' کا مطلب بدلہ ہے،یعنی ان کے اعمال اور کرتوتوں کی وجہ سے یہ بدلہ ان کو ملا، نیز فرمان باری تعالی:''ليذيقهم بعض الذي عملوا''(تا کہ ان کو ان کے بعض اعمال کا بدلہ چکھائے)، اس میں'' لام'' تعلیل یعنی علت بیان کرنے کے لئے ہے، امام ابن عاشورؒ تحریر فرماتے ہیں:فرمان باری تعالی:''في البر والبحر''(خشکی وتری میں)یہ اس بات پر دال ہے کہ بگاڑ اور حالات کی ابتری زمین کی خشکی وتری کے سارے منافع کو شامل ہے''(۱)۔

سمندر کے فساد وبگاڑ کی نمایاں شکل یہ ہے کہ سمندر کے منافع کو معطل کر دیا جائے، جیسے: مچھلیوں، موتی اور مونگے (چھوٹے موتی) کی قلت ہوجائے، اور بہ کثرت طوفان آنے لگے جو سفر کے منظّم ہونے میں حائل ہوجائیں۔ خشکی کا فساد یہ ہے کہ اس کے منافع مفقود ہوجائیں اور اس کی مضرتیں اور نقاصانات رونما ہونے لگیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ خوراک یعنی کھیتی، پھل اور گھاس موقوف ہوجائے، قابل انتفاع جانور کی موت ہونے لگے، ٹڈی، حشرات الارض (کیڑے مکوڑے) اور بیماریاں پھیل جائیں، بڑے بڑے کارخانوں سے نکلنے والے زہریلے کچرے میٹھے اور کھارے پانی میں ڈال دیئے جائیں، جو دریاؤں کے پانی اور سمندروں کی مچھلی سے انسان کے استفادہ سے محرومی کا سبب بن جائے۔

البخاری، مرجع سابق، کتاب:المزارعہ، باب:فضل الزرع والغرس.....، حدیث نمبر:۲۱۹۵۔

ایک دوسری نص میں ہے:'' جو مردہ زمین کو زندہ یعنی آباد کرے وہ اسی کے لئے ہے''، دیکھئے: سجستانی، ابوداؤد، سلیمان بن الاشعث، سنن ابی داؤد، تحقیق:محمد محی الدین عبد الحمید، بیروت، دار الفکر، (د،ت)، کتاب:السنن، کتاب الخراج، باب:فی احیاء الموات، ج۲،ص:۱۹۴، حدیث نمبر:۳۰۷۳۔

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۲۱،ص:۱۱۰۔

ب-انجام دیئے گئے اعمال اور بلند کئے جانے والے ہتافات اورنعروں کے درمیان تضاد پر مبنی فساد:

تدبیر کے فساد کی ایک شکل یہ ہے کہ ہتافات اورنعروں کی سطح پر اصلاح کا دعوی کیا جائے، جبکہ عملی طو پر انجام دیئے جانے والے امور کی سطح پر فساد وبگاڑ پرزور ہو، مثال کے طور پر: قرآن مجید نے فرعون وموسی علی نبینا وعلیہ السلام کی رسالت کے بارے میں اس کے موقف کو یوں بیان کیا ہے: ارشاد الٰہی ہے: "**وقال فرعون: ذروني أقتل موسى وليدع ربه إني أخاف أن يبدل دينكم أو أن يظهر في الأرض الفساد**" (سورۂ غافر:۲۶) (اورفرعون نے کہا: مجھے چھوڑو، میں موسی کوقتل کردوں، اور چاہئے کہ وہ اپنے رب کو پکارے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے گا، یا زمین میں فساد پھیلائے گا)۔

اسی طرح قرآن مجید نے منافقین کے موقف اور رویہ کے تضاد کو بھی بیان کیا ہے کہ: وہ ایک طرف نظریاتی اعتبار سے اصلاح کے دعویدار ہیں، تو دوسری طرف عملی اعتبار سے زمین میں فساد کوانجام دیتے ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: "**وإذ قيل لهم لا تفسدوا في الأرض قالوآ إنما نحن مصلحون، ألا إنهم هم المفسدون ولكن لا يشعرون**" (سورۂ بقرہ: ۱۱-۱۲) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے زمین میں فساد مت مچاؤ تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔

فساد تدبیر کے مظہر کے ضمن میں منافقین کا فساد بھی داخل ہے، جیسا کہ اس منافق کا حال ہے جس کے دل میں روگ ہے، لیکن اس نے اپنی بیماریوں: جھوٹ، خوف، دھوکہ اور فریب دہی کا علاج نہیں کیا۔ فرمان باری تعالی ہے: "**في قلوبهم مرض فزادهم الله مرضا**" (سورۂ بقرہ:۱۰) (ان کے دل میں روگ ہے، سواللہ نے ان کے روگ کو بڑھا ہی دیا)۔

دوسرے الفاظ میں: نفاق فساد کا سرچشمہ ہے، اس سے بہت سے مفاسد جنم لیتے ہیں، جن میں نمایاں ترین: گفتگو میں کذب بیانی اور اعمال کے اندر دھوکہ دہی ہے جو کہ عملی جھوٹ ہے،

اورخوف کا مفسدہ ہے، چنانچہ جھوٹ اور خداع دوایسے مفسدہ ہیں جوان سے صادر ہوتے ہیں جو کسی معاملہ کی حقیقت کے اظہار سے خوف زدہ ہوتے ہیں، نیز تینوں مفاسد میں سے ہر مفسدہ کے اندر مذموم خصائل میں سے کوئی خصلت مضمر ہے۔ چنانچہ کذب بیانی حماقت کے نتیجے میں جنم لیتی ہے، اس لئے کہ جھوٹا شخص اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کی کذب بیانی تمام لوگوں کے اندر پھیل جائے گی۔ اور یہ حماقت ہے جو ذکاوت اور ذہانت کی کمی سے جنم لیتی ہے، اس لئے کہ ذہین آدمی سمجھتا ہے کہ لوگوں میں اس جیسے اور اس سے بہتر افراد بھی پائے جاتے ہیں، جبکہ حماقت سنگین ترین مفاسد میں مبتلا کردیتی ہے، جیسے: حقائق کا علم نہ ہونا، عقلی ادراک وفہم کے مراتب سے ناواقفیت، جیسے: توہمات یا سفاہت ونادانی جو کہ رائے میں ایک قسم کا خلل ہے۔ جہاں تک کہ دھوکہ دہی کا تعلق ہے تو اس سے لوگوں کے درمیان عداوت پیدا ہوتی ہے اس وجہ سے کہ لوگوں کو دھوکہ باز کی دھوکہ دہی کا احساس ہوتا ہے، اسی وجہ سے جملہ ''اللہ نے ان کے مرض میں اضافہ کردیا'' اس سے فساد کے اندر منافقین کے دور تک نکل جانے کا سبب معلوم ہوتا ہے، جو یہ ہے کہ ان کے دلوں میں روگ ہے، اور یہ روگ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، چونکہ یہ بڑھوتری اللہ تعالی کی طرف سے ہے، اس لئے اس کے دور ہونے کی کوئی امید بھی نہیں ہے''(۱)۔

۱- بعض مفسرین کہتے ہیں کہ: یہ ان کے حق میں بددعا ہے، جیسے: جبیر بن اضبط شاعر کہتا ہے: ''**تباعدعني فطحل إذ دعوته**.....**أمين فزادالله ما بيننا بعدا**'' (فطحل کو جب میں نے پکارا تو وہ مجھ سے دور ہوگیا۔ اللہ تعالی ہماری دوری میں اضافہ ہی کرے، اے اللہ تو اس بددعا کو قبول فرما)۔ امام ابن عاشورؒ نے اس تفسیر کو کئی وجوہات سے پسند نہیں فرمایا ہے، پہلی وجہ یہ ہے کہ: فاء کے ذریعہ عطف میں یہ خلاف اصل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ: اس طرح منافقین کو برا بھلا کہنے کے درپے ہونا قرآن کریم کا طریقہ نہیں ہے، تیسری وجہ یہ ہے کہ مرض میں اضافہ کی بددعا اس روش کے خلاف ہے جو معلوم ہے کہ گمراہوں کو ہدایت کی دعا دی جاتی ہے، جیسے نبی کریم ﷺ نے اپنی قوم کے لئے دعا کرتے ہوئے فرمایا: ''اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما؛ کیونکہ انہیں حقیقت کا علم نہیں ہے''۔ دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۱، ص۲۸۲۔

ت-انتساب کا فساد:

تدبیر کے فساد سے ہی فسادیوں کی طرف نسبت رکھنا ہے اور ان کے لئے دعا کرنا ہے، یہ بھی فساد کی ایک صورت ہے، جیسے: نوح علی نبینا وعلیہ السلام کی صورت حال تھی کہ باپ ہونے کے جذبہ میں وہ اللہ عزوجل کو پکار اٹھے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے: ''**ونادى نوح ربه فقال رب إن ابني من أهلي وإن وعدك الحق وأنت أحكم الحاكمين، قال يانوح إنه ليس من أهلك إنه عمل غير صالح فلا تسئلن ما ليس لك به علم إني أعظك أن تكون من الجاهلين**'' (سورۂ ہود ۴۵-۴۶) (اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے پروردگار! یقیناً میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے، اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا: اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ اس کا عمل نیک وصالح نہیں ہے، لہذا مجھ سے ایسی چیز کے بارے میں درخواست نہ کرو جس کا مجھے علم نہیں ہے، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادانوں میں سے نہ بنو)۔

اللہ تعالی نے اس آیت کریمہ کے ذریعہ اس دعا سے صلاح ودرستگی کی صفت دور کردی ہے جس سے فسادیوں کو نفع پہنچانے کا قصد کیا جارہا ہو، نجات صرف اسی کو حاصل ہوگی جو صحیح عقیدہ کی طرف انتساب رکھتا ہو اور نیک عمل کے ذریعہ اس کا ثبوت فراہم کرتا ہو(۱)۔

ث: قلبی محبت اور ''ولاء'' پر مبنی فساد:

اس کی طرف فرمان باری تعالی مشیر ہے: ''**والذين كفروا بعضهم أولياء بعض إلا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد كبير**'' (سورۂ انفال: ۷۳) (اور جو کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے حمایتی اور رفیق ہیں، اگر تم ایسا نہیں کرتے ہو کہ (ان کی حمایت ونصرت سے باز

۱- فرمان باری تعالی: ''إنه عمل غير صالح'' میں کسائی کی قراءت میں ''عمل'' ماضی کا صیغہ ہے اور ''غیر'' پر فتحہ ہے، اور مفہوم یہ ہے کہ تیرے بیٹے نے نیک عمل نہیں کیا ہے بلکہ شرک کیا ہے اور صحیح دین کو جھٹلایا ہے، دیکھئے: رازی، التفسیر الکبیر ''مفاتیح الغیب''، مرجع سابق، ج ۱۸، ص: ۳۔

رہو) تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد مچے گا)۔اس آیت کے مطابق چونکہ کفار باہم جتھا بند اور ایک دوسرے کے معاون ہیں، اس لئے ایک دوسرے سے دلی محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی نصرت ومدد کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے سے قلبی محبت کرنے اور ایک دوسرے کی نصرت ومدد سے باز نہ آئیں، اہل ایمان کے درمیان اس ایمانی تعلق کے بغیر زمین میں فتنہ برپا ہوگا اور بڑا فساد مچے گا، اور اس سے بڑا کوئی فساد نہیں ہے کہ اہل کفر، اہل فسق اور اہل معصیت اہل استقامت، اہل طاعت اور اہل ایمان پر غالب آجائیں۔ اس فساد کے ازالہ کی خاطر فرمان باری تعالی پر لبیک کہنا لازم ہے۔ جس میں کہا گیا ہے: ''**يأيها الذين آمنوا لا تتخذوا عدوي وعدوكم أولياء تلقون إليهم بالمودة وقد كفروا بما جاء كم من الحق**'' (سورۂ ممتحنہ:۱) (اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ کہ ان سے قلبی محبت کرنے لگو، حالانکہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو ان کے پاس آیا ہے)۔

ج- دھوکہ دہی:

تدبیر کے فساد کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ناپ وتول میں دھوکہ دہی کا معاملہ کیا جائے، فرمان باری تعالی ہے: ''**وإلى مدين أخاهم شعيبا قال ياقوم اعبدوا الله مالكم من إله غيره ولا تنقصوا المكيال والميزان إني أراكم بخير وإني أخاف عليكم عذاب يوم محيط، وياقوم أوفوا المكيال والميزان بالقسط، ولا تبخسوا الناس أشياء هم ولا تعثوا في الأرض مفسدين، بقيت الله خير لكم إن كنتم مؤمنين وما أنا عليكم بحفيظ**'' (سورۂ ہود: ۸۴-۸۶) (ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ انہوں نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی پرستش اور عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، اور ناپ وتول میں کمی نہ کرو۔ میں تمہیں اچھی حالت میں دیکھ رہا ہوں، اور مجھے تمہارے حق میں گھیر لینے والے دن کے عذاب کا بھی اندیشہ ہے۔ اے میری قوم! انصاف کے

ساتھ پورا پورا ناپو اور تولو، اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دو، اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو۔ اللہ کا عطا کردہ مال ہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو، اور میں تمہارے حق میں نگراں و داروغہ نہیں ہوں)۔

اس آیت میں مکرر پورا پورا ناپنے اور تولنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے کہ ناپ وتول میں کمی ان سنگین مفاسد میں سے ایک ہے، جس کا مرتکب چوری اور دھوکہ دہی کی دو خصلت کا جامع ہے(۱)۔

ناپ وتول میں دھوکہ دہی کی اصلاح عدل وانصاف سے ہوگی، اور یہ تبھی ممکن ہے جبکہ پورا پورا ناپا اور تولا جائے، فرمان الٰہی ہے: "**و أوفوا الكيل والميزان بالقسط لا نكلف نفسا إلا وسعها**" (سورۂ انعام: ۱۵۲) (انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپو اور تولو، ہم ہر شخص کو اس کی وسعت کے بقدر ہی مکلّف و پابند بناتے ہیں)۔

لہذا مطلوب یہ ہے کہ پورا پورا ناپنے اور تولنے میں مکمل سعی وکوشش کی جائے۔ لیکن ناپ وتول میں کوئی غلطی ہو جائے تو یہ انسان کی طاقت سے باہر کی چیز ہے؛ کیونکہ اللہ تعالی ہر ایک کو اس کی طاقت کے بقدر ہی مکلّف و پابند بناتا ہے۔ اس سے صرف دھوکہ دہی کے قصد پر مؤاخذہ ہوگا۔ بالقصد دھوکہ دہی کرنے والوں کے حق میں ہی یہ وعید آئی ہے۔ فرمان باری تعالی ہے: "**ويل للمطففين، الذين إذااكتالوا على الناس يستوفون، وإذا كالوهم أو وزنوهم يخسرون، ألايظن أولائک أنهم مبعوثون، ليوم عظيم، يوم يقوم الناس لرب العالمين**" (سورۂ مطففین: ۱-۶) (تباہی ہے ان لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، جو لوگوں سے پورا پورا ناپ کر لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو ڈنڈی مار دیتے ہیں (کمی کر دیتے ہیں)، کیا ان لوگوں کو گمان نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے دن کے لئے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، جس دن لوگ سارے جہاں کے رب اور مالک کے سامنے کھڑے ہوں گے)۔

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۱۲، ص ۱۳۷۔

ح-برتری:

تدبیر کے فساد کی ایک شکل یہ ہے کہ مخلوق الٰہی پر برتری کا اظہار کیا جائے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**تلک الدار الآخرة نجعلها للذين لايريدون علوا في الأرض ولافسادا**"(سورۂ قصص:۸۳)(یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں برتری اور فساد نہیں چاہتے ہیں)۔

نیز فرمان باری تعالی ہے:"**إن فرعون علافي الأرض وجعل أهلها شيعا يستضعف طائفة منهم يذبّح أبناء هم ويستحي نساء هم إنه كان من المفسدين**"(سورۂ قصص:۴)(یقیناً فرعون نے زمین میں (اپنے ملک میں) اقتدار و بڑائی کے مظاہرے کئے، اس نے وہاں کے باشندگان کو گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور سمجھتا تھا، ان کے فرزندوں کو مار ڈالتا تھا اور ان کی خواتین کو زندہ رکھتا تھا، یقیناً وہ فساد مچانے والوں میں سے تھا)۔

امام رازیؒ کے نزدیک "علو و برتری کا مطلب اقتدار کی قوت ہے.....۔ پھر اللہ تعالی نے اس کی تفصیل یوں کی ہے:"**وجعل أهلها شيعاً**"(اس نے اس کے باشندگان کو گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا) یعنی یہ لوگ اس کے ارادہ اور مطلوب و مقصود کے مطابق اس کی موافقت اور ہمنوائی کرتے تھے"(۱)۔

جبکہ امام ابن عاشورؒ نے "علو و برتری" کا تعین اس طرح فرمایا ہے کہ یہ حق کے مقابلہ میں تکبر و گھمنڈ اختیار کرنا ہے، اور برتری کا اظہار کرنے والے کا اس بات کا احساس دلانا ہے کہ اس کی ذات کا مقام و مرتبہ سب سے اعلی و بلند ہے، حتی کہ کوئی اس کے برابر کا نہیں ہے۔ چنانچہ جو برتری کا اظہار کرتا ہے وہ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں فائق و برتر ہے، جبکہ اس کا کوئی صحیح و مبنی برحق سبب نہیں ہوتا ہے، یعنی اس میں دین یا شریعت یا دوسرے کے

۱- رازی، التفسیر الکبیر "مفاتیح الغیب"، مرجع سابق، ج ۲۴، ص:۲۰۵۔

حق کی کوئی رعایت نہیں ہوتی ہے۔ یہ تدبیر کے فساد کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے، اس لئے کہ برتری ظاہر کرنے والا تکبر وگھمنڈ کرتا ہے، اور اپنے تصرفات اور سرگرمیوں میں دوسرے کے مصالح کے تحفظ کی پرواہ نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ اپنی خواہشات، شہوتوں اور مکروہ وناپسندیدہ انانیت کے دستور کا پابند ہوتا ہے۔ فساد تدبیر کی یہ صورت فرعون کے اندر اس حد تک پہنچ گئی کہ اس نے خود کو ''خدا'' قرار ڈالا، اور یہ کہ وہ سورج کا بیٹا ہے۔

جملہ: ''بے شک وہ فسادیوں میں سے تھا''، جملہ: ''**إن فرعون علا في الأرض**'' (یقیناً فرعون نے زمین میں برتری کا اظہار کیا) کی تعلیل ہے۔

مطلقا بغیر کسی تفصیل کے ہر برتری مذموم نہیں ہے، اس لئے کہ عالم، جاہل کے مقابلہ میں برتر ہے، نیک بد سے فائق ہے اور ذکی وذہین، غبی وکند ذہن سے ممتاز ہے۔ اسی طرح امیر وحاکم کو مامور ومحکوم پر فوقیت حاصل ہے، نیز قاضی وجج کو مقدمہ لانے والے فریق پر برتری حاصل ہے، امام ابن عاشورؒ کے بقول سب سے زیادہ منصفانہ فوقیت وہ ہے جو دین وشریعت کی طرف سے حاصل ہو، جیسے: مومن کو کافر پر فوقیت حاصل ہے اور تقوی شعار کو بدکار پر برتری حاصل ہے۔ فرمان باری تعالی ہے: ''**لايستوي منكم من أنفق من قبل الفتح وقاتل أولائک أعظم درجة من الذين أنفقوا من بعد وقاتلوا وكلا وعدالله الحسنى**'' (سورۂ حدید:۱۰) (تم میں سے جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی اس کے برابر وہ نہیں ہوسکتے (جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا) ان کا درجہ فتح مکہ کے بعد خرچ کرنے والوں اور جنگ کرنے والوں سے بہت بلند ہے (لیکن) ہر ایک کے ساتھ اللہ کا اچھا وعدہ ہے)(۱)۔

بہرحال علو وبرتری کے اثرات کے لحاظ سے مختلف مفاسد ہیں، جو درج ذیل ہیں:

تکبر وگھمنڈ اور سرکشی کا مفسدہ:

تکبر اور سرکشی کے بطن سے بہت سے مفاسد جنم لیتے ہیں، مثلاً: لوگوں کو حقیر سمجھنا، ان

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۲۰، ص: ۶۶۔

کے حقوق کو ہلکا سمجھنا، ان کے ساتھ برابر تاؤ کرنا اور ان کو وسائل وذرائع اور محض اشیاء کے درجہ میں سمجھنا جن کے ذریعہ متکبر وگھمنڈی کی خواہشات اور شہوتیں پوری ہوں اور سرکش کی حاجت برآری ہو، بہرحال تکبر، بالخصوص حاکم، یا لوگوں کے معاملات کے ذمہ دار، یا ان کے معاملات میں سے کسی معاملہ کے ذمہ دار کے تکبر وگھمنڈ کے نتیجے میں لوگوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں، ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کو حد سے زیادہ لوٹا اور کھسوٹا جاتا ہے۔

قارون نے اپنے علم ومال پر تکبر کیا۔ یہ فکری اور مالی بگاڑ کی ایک شکل ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**إن قارون كان من قوم موسى فبغى عليهم وآتيناه من الكنوز ما إن مفاتحه لتنوء بالعصبة أولى القوة إذ قال له قومه لا تفرح إن الله لايحب الفرحين**'' (سورۂ قصص:۷۶) (بے شک قارون موسیٰ کی قوم کا ایک فرد تھا، پھر اس نے ان کے خلاف سرکشی اختیار کی، ہم نے اسے اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی چابیاں طاقتور جوان بھی بہ مشکل اٹھا پاتے تھے۔ جب اس کی قوم نے اس سے کہا: اتراؤ مت، یقیناً اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے)۔ اس لئے اس کا انجام وہ ہوا جو فرمان باری تعالی میں مذکور ہے: ''**فخسفنا به وبداره الأرض**'' (سورۂ قصص:۸۱) (سو ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا)۔

اسی طرح فرعون نے اپنے اقتدار اور ملک کی زراعتی اور مالی قوت کی وجہ سے تکبر کیا۔ یہ سیاسی تدبیر وانتظام میں فساد وبگاڑ کی ایک شکل ہے۔ فرعون کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے: ''**ونادى فرعون في قومه قال يقوم أليس لي ملك مصر وهذه الأنهار تجرى من تحتي**'' (سورۂ زخرف:۵۱) (فرعون نے اپنی قوم میں آواز لگائی، اس نے کہا: اے میری قوم! کیا مجھے مصر کی بادشاہت حاصل نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے رواں نہیں ہیں)۔ نیز فرمان باری تعالی ہے: ''**واستكبرهو وجنوده في الأرض بغير الحق وظنوا أنهم إلينا لايرجعون**'' (سورۂ قصص:۳۹) (فرعون اور اس کے لشکر نے زمین میں ناحق بڑائی جتائی اور تکبر

وگھمنڈ کیا۔اوران کا گمان تھا کہ وہ ہماری طرف پلٹ کرنہیں آ ئیں گے)۔

گھمنڈی انسان لوگوں کے مصالح کی تحصیل اوران سے مفاسد کے ازالہ کی پرواہ نہیں کرتا ہے۔ابن عاشورؒ کے بقول اسے پہلے درجہ میں صرف اسی سے سروکار رہوتا ہے کہ وہ ''لوگوں کے منافع لوٹے اور کھسوٹے ،اوراپنے اغراض ومقاصد حاصل کرنے کے لئے ان میں سے جسے چاہے مسخر کرے۔سیاست وانتظام کے سلسلے میں ان کے حق میں کوئی نرمی نہ برتے ، بلکہ ان کے ساتھ درشتی وسختی کے ساتھ معاملہ وبرتاؤ کرے۔اس طرح اپنی پکڑ اور طغیانی کی بنا پر ان کے دل میں رعب بٹھائے''(۱)۔یہ بڑا جامع ، مرکزی اور بنیادی مفسدہ ہے؛ کیونکہ اس سے مزید دو مفسدے پیدا ہوتے ہیں:

گروہوں میں بانٹنے کا مفسدہ:

یعنی فرعون نے ایک ہی سلطنت کے باشندگان کو گروہوں میں تقسیم کررکھا تھا۔کسی گروہ کو فساد وبگاڑ میں مبتلا بادشاہ خود سے قریب رکھتا تھا،تو کسی دوسرے گروہ کو خود سے دور کردیتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کے مقرب گروہ بادشاہ کے دور کردہ گروہوں کے مقابلہ میں تکبر جتائے اور فخر کرے۔ایسے ہی باہمی حسد وجلن اور بغض ونفرت سے لبریز زہریلے ماحول میں جھوٹ پر مبنی چغلخوریاں ہوتی ہیں۔جبکہ نیک وصالح بادشاہ تمام لوگوں کے ساتھ برابر کے فاصلے رکھتا ہے۔تمام لوگ اس کے نزدیک ایسے ہوتے ہیں،جیسے بیٹے باپ کے نزدیک ہوتے ہیں، وہ سب کے لئے بھلائی پسند کرتا ہے،اورنرمی اور عدل وانصاف کے ساتھ ان کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے دربار میں کسی فرقہ کو دوسرے فرقہ پر امتیاز حاصل نہیں ہوتا ہے۔امت کے افراد نفسیاتی، ذہنی اور عقلی خصوصیات کے لحاظ سے اس سے قریب ہوتے ہیں''(۲)۔

۱- ابن عاشور،التحریر والتنویر،مرجع سابق،ج ۲۰،ص ۶۸۔

۲- مرجع سابق،ج ۲۰،ص ۶۹۔

ضعیف قرار دینے کا مفسدہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ گروہوں کے درمیان امتیاز برتا جائے، کوئی گروہ ایسا ہو جس کے حقوق مارے جائیں، اور اس پر تاوان لازم کیا جائے۔ جبکہ دوسرے گروہ پر انعامات وافضال کی بارش ہو، مال و دولت اور غنیمت سے اسے بھرپور حصہ ملے۔ یہ سب خلق الٰہی کے خلاف تکبر وگھمنڈ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے بڑائی وبرتری جتانے اور ضعیف قرار دینے کے مفسدہ کے پہلو میں دوسرے مفاسد، جیسے: غلامی، فرزندوں کو ذبح کرنا اور خواتین کو زندہ رکھنے کا ذکر کیا ہے۔

قرآن مجید میں وارد فساد تدبیر کے مظاہر کے ہمارے استقراء سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سارے مظاہر ایک مشترکہ عنصر سے مربوط ہیں جس کی لڑیوں میں سب پروجاتے ہیں، اور وہ سب زمینی فساد کے عنصر سے وابستہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فساد تدبیر کی اگرچہ متعدد قسمیں ہیں، لیکن زمینی فساد کا عنصر اکثر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ بہرحال قرآن مجید نے زمین میں فساد وبگاڑ سے متعدد مقامات پر منع فرمایا۔ چند آیات درج ذیل ہیں:

فرمان باری تعالی ہے: "**أتذر موسى وقومه ليفسدوا في الأرض**" (سورۂ اعراف: ۱۲۷) (کیا آپ موسی اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑے رکھیں گے کہ وہ زمین میں فساد پھیلائیں)۔ ایک جگہ ہے: "**وكان في المدينة تسعة رهط يفسدون في الأرض ولا يصلحون**" (سورۂ نمل: ۴۸) (شہر میں نو افراد کا جتھا تھا جو زمین میں فساد مچاتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے)۔

ایک دوسرے مقام پر ہے: "**وجحدوا بها واستيقنتها أنفسهم ظلما وعلوا فانظر كيف كان عاقبة المفسدين**" (سورۂ نمل: ۱۴) (انہوں نے جان بوجھ کر ازراہ ظلم وبڑائی جتانے کی خاطر اس کا انکار کیا، جبکہ ان کے دل میں اس کا یقین تھا۔ سو دیکھو فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟)۔

ایک آیت میں ہے: "لتفسدن في الأرض مرتين" (سورۂ اسراء:۴) (تم دوبار زمین میں فساد مچاؤ گے)۔ ایک دوسری آیت میں ہے: "ولا تبغ الفساد في الأرض" (سورۂ قصص:۷۷) (اور زمین میں فساد مت چاہو)(۱)۔

ایک تیسری آیت میں ہے: "ولاتعثوا في الأرض مفسدين" (سورۂ ہود:۸۵) (اور زمین میں فساد مت مچاتے پھرو)۔ ایک چوتھی آیت میں ہے: "اخلفني في قومي وأصلح ولاتتبع سبيل المفسدين" (سورۂ اعراف:۱۴۲) (میری قوم کے اندر میری نیابت کرو اور اصلاح کرتے رہو اور فسادیوں کی راہ کی پیروی مت کرو)۔ ایک پانچویں آیت میں ہے: "إن يأجوج ومأجوج مفسدون في الأرض" (سورۂ کہف:۹۴) (یقیناً یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد مچاتے ہیں)۔ ایک چھٹی آیت میں ہے: "لو كان فيهما آلهة إلا الله لفسدتا" (سورۂ انبیاء:۲۲) (اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو دونوں درہم وبرہم ہوجاتے اور ان کے اندر فساد پھیل جاتا)۔

یعنی اگر آسمان وزمین میں دوسرے خدا ہوتے، اگر ان دونوں کے اندر موجود مخلوقات صرف اللہ کے کنٹرول میں نہیں ہوتیں، تو دونوں میں فساد پھیل جاتا، اور جس نظام کے ساتھ دونوں پیدا کئے گئے ہیں وہ درہم برہم ہوجاتا۔ جو محل آیت میں مذکور ہے، اس کے مدنظر فساد سے مقصود آسمان وزمین کے نظام کا اس طرح درہم برہم ہونا ہے کہ ان سے فائدہ نہ اٹھایا جاسکے۔ ''اس طرح آسمان وزمین کا فساد یہ ہے کہ وہ مناسب حالت میں نہ رہیں، اور ان کا نظام مربوط اور ہم آہنگ باقی نہ رہے، جس کی وجہ سے ان دونوں میں موجود چیزوں سے فائدہ نہ اٹھایا جاسکے''(۲)۔

۱- اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو زمین میں فساد کا طلب گار ہوتا ہے، وہ متعدد وسائل کو فساد کا ذریعہ بناتا ہے، جیسے: ظلم، غصب اور حقوق سے محروم کردینا، اور دوسرے آلات ووسائل اور کارروائیاں۔

۲- آسمان کے صحیح حالت میں رہنے کے کئی مظاہر ہیں: جیسے: اس کے سیاروں کا نظام، اور ان کے طلوع وغروب ہونے کے اوقات کا انضباط.....زمین کی صلاح کی عملی شکل یہ ہے کہ اس میں چلنا آسان ہے، اور اس میں کھیتی اور

گذشتہ سارے مظاہر کے پیش نظر ہم فسادیوں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کے حکم الٰہی کے مقصود کو سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے: فرمان باری تعالیٰ ہے: ''**وانظروا كيف كان عاقبة المفسدين**'' (سورۂ اعراف:۸۶) (دیکھو کہ فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟)، نیز ارشاد الٰہی ہے: ''**فانظر كيف كان عاقبة المفسدين**'' (سورۂ اعراف:۱۰۳) (لہذا دیکھو کہ فساد پھیلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟)، ایک دوسرے موقع سے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''**فاذكروا ألآء الله ولا تعثوا في الأرض مفسدين**'' (سورۂ اعراف:۷۴) (سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو)۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے تذلل وعاجزی وانکساری اور گریہ وزاری کے محل میں فساد کی ممانعت وارد ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''**ولا تفسدوا في الأرض بعد إصلاحها**'' (سورۂ اعراف:۵۶) (زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت مچاؤ)۔

استاذ سید قطبؒ تحریر فرماتے ہیں: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی وانکساری اور تذلل وگریہ وزاری کا اظہار کرتا ہے..... وہ زمین میں فساد نہیں پھیلا سکتا'' (۱)۔

یہی وجہ ہے کہ گریہ وزاری کرنے والے اور عاجزی وانکساری اختیار کرنے والے کے لئے مناسب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار کے مقابلہ میں طغیانی وسرکشی نہ کرے کہ اللہ عزوجل کے زمین کو درست کرنے کے بعد اس میں فساد مچائے۔ یہ عمومی ممانعت ہے جس میں متعدد امور شامل ہیں، جن میں سرفہرست اللہ سبحانہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، اس لئے کہ اس میں بھی اس زمین میں بگاڑ وفساد پیدا کرنا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل کی بعثت اور مسلسل آنے والے پختہ ومستحکم شرائع، احکام اور قوانین کے ذریعہ درست کر رکھا ہے۔ زمین کی اصلاح ودرستگی کے بعد

درختوں کو اگانے کی صلاحیت ہے، اور وہ چراگاہ، پتھر، معادن وکان اور لکڑیوں پر مشتمل ہے۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۱۷، ص۴۰۔

۱- قطب، فی ظلال القرآن، مرجع سابق، ج۸، ص:۵۲۸۔

اس میں بگاڑ وفساد پیدا کرنے والے امور یہ ہیں: عقل کا استعمال نہ کیا جائے، جانوں کا تحفظ نہ کیا جائے اور ظلم وجبر وزیادتی اور استبداد ومطلق العنانی کا ارتکاب کیا جائے (۱)۔

اس طرح فرمان باری تعالی: ''اسے درست کرنے کے بعد'' کے اندر بعدیت حقیقی ہے، اس لئے کہ زمین پہلے مرحلہ سے ہی صلاح ودرستگی پر پیدا کی گئی ہے، میری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی نے زمین کو درست نظام کے ساتھ پیدا کیا ہے، فرمان باری تعالی ہے: ''**وجعل فيها رواسي من فوقها وبارک فيها وقدر فيها أقواتها**'' (سورۂ فصلت:۱۰) (اور اس نے زمین میں اس کے اوپر مضبوط پہاڑ کھڑے کئے ہیں، اور اس میں برکت رکھی ہے اور اس کے اندر خوراک کی چیزیں ایک اندازے سے پیدا کی ہیں)۔

اور اس نظام کو ایسے قوانین کے ذریعہ پختہ کیا ہے جن کو انبیاء ورسل، صالحین اور حکماء کی زبان سے وضع کیا ہے (۲)۔

بہرحال زمین میں فساد تدبیر کی متعدد ومتنوع شکلیں ہیں۔ اسی فساد تدبیر سے درست چیزیں بنا کر ان کو مضرت رساں چیزوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، جیسے: کھانے کی چیزوں میں ملاوٹ کر دی جاتی ہے۔ اسی فساد تدبیر کے ذریعہ نظاموں کو بگاڑ دیا جاتا ہے، مثلاً: فتنے وفساد پیدا کئے جاتے ہیں اور ظلم وستم کا بازار گرم کیا جاتا ہے، نیز اسی فساد تدبیر سے سعی وکاوش کو بگاڑ دیا جاتا

۱- (رازی، التفسیر الکبیر ''مفاتیح الغیب''، مرجع سابق، ج ۱۴، ص:۱۱۹-۱۲۰، نیز دیکھئے: ابن عطیہ، اندلسی، ''المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز''، مرجع سابق، ج ۲، ص:۴۱۰۔ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، ''جامع البیان عن تأویل ای القرآن''، تحقیق: احمد محمد شاکر، قاہرہ، مکتبہ ابن تیمیہ، (د،ت)، مجلد:۱۲، ص:۴۸۷۔

ابن قیمؒ رقمطراز ہیں: ''جو عالم کے احوال پر غور کرے گا وہ پائے گا کہ زمین کی ہر درستگی کا سبب اللہ سبحانہ کی توحید، عبادت وپرستش اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ جبکہ دنیا کے ہر شر وفساد، آفت وبلا، قحط وخشک سالی اور دشمن کے مسلط ہونے اور دیگر برائیوں کا سبب رسول کی مخالفت اور اللہ اور رسول کے علاوہ کی دعوت ہے''، شیخ رشید رضا تحریر فرماتے ہیں: ''سب سے زیادہ سنگین نوعیت کا فساد: تکبر اور سرکشی ہیں جو ظلم وجور اور بڑائی جتانے کا سبب بنتے ہیں''، رضا، تفسیر القرآن الحکیم ''تفسیر المنار''، مرجع سابق، ج ۸، ص ۴۶۱۔

۲- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۸، قسم ثانی، ص:۱۷۵۔

ہے، مثلاً: جہالت کو فروغ دیا جاتا ہے، بدکاری کی تعلیم دی جاتی ہے، کفر کو مزین کر کے پیش کیا جاتا ہے اور صالحین اور مصلحین سے مقابلہ اور جنگ کی جاتی ہے۔ ان ہی مظاہر میں ہم اس انتظامی، مالی اور سیاسی فساد کو شامل کر سکتے ہیں، جن کے بارے میں ہم سنتے رہتے ہیں، پڑھتے رہتے ہیں اور مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

چنانچہ پیداواری جدوجہد وکاوش اور مقابلہ آرائی کے شرائط کی رعایت کے بغیر، نیز شفافیت اور یکساں مواقع نہ ہونے کے باوجود مالدار بننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف ریفرنڈم، استصواب رائے اور انتخابات کے اندر لوگوں کے ارادے، مرضی اور اختیار کے اندر دھوکہ دہی اور جعلسازی کے اسلوب اپنا کر ذمہ داری کے سیاسی اور غیر سیاسی مناصب کو حاصل کر لیا جاتا ہے، نیز ٹیکس ادا کرنے والے کے ارادہ کے احترام کے بغیر مالدار بننے کے لئے اقتدار کا غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سب کے سب فساد کی وہ قسمیں ہیں جو اس فساد کے ضمن میں داخل ہیں، جسے قرآن مجید نے ''زمین میں فساد'' سے تعبیر کیا ہے۔

یقیناً فساد تدبیر اپنے تمام نتائج: قتل، خونریزی، تخریب کاری، مطلق العنانیت، بڑائی کے مظاہرہ، تکبر وگھمنڈ اور ناپ وتول میں کمی سمیت اس پرامن زندگی اور مادی، فکری اور ثقافتی زندگی کے اسباب کی ترقی کی ضد ہے جو آبادکاری کا لازمی تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوحیان اندلسی نے متعدد فساد کو زمین کی تخریب کاری اور تعمیر وآبادکاری کے سلسلہ میں اللہ تعالی کے ارادہ کی مخالفت قرار دیا ہے۔

۲- درست تدبیری عمل:

متعدد سماجی، اقتصادی، سیاسی، قانونی اور انسانی مصالح کے اندر درست وصالح تدبیر نمایاں ہے، ایک صورت وہ ہے جو سورۂ کہف کے اندر ان دولڑکوں کے واقعہ میں مذکور ہے، جن کے خزانہ پر ''خضر'' علی نبینا وعلیہ السلام نے دیوار سیدھی کر دی تھی، اور موسی علیہ السلام کو اس پر اشکال ہوا تھا۔ فرمان باری تعالی ہے: ''**فانطلقا حتى إذاأتيا أهل قرية استطعما أهلها**

فأبوا أن يضيفوهما فوجدا فيها جدارا يريد أن ينقض فأقامه، قال لوشئت لتخذت عليه أجرا''(سورۂ کہف:۷۷)(وہ دونوں چلے یہاں تک کہ ایک بستی والے کے پاس پہنچے، اوران سے کھانا طلب کیا، ان لوگوں نے ان کومہمان بنانے سے انکار کردیا، وہاں انہوں نے ایک دیوار کو پایا جو گرا چاہتی تھی، ''خضر'' نے اسے سیدھی کردیا۔موسیٰ بول پڑے:اگرآپ چاہتے تواس کی اجرت مقرر کرلیتے)۔

نیز فرمان باری تعالی ہے:''**وأما الجدار فكان لغلامين يتيمين في المدينة وكان تحته كنزلهما وكان أبوهما صالحا فأراد ربک أن يبلغا أشدهما ويستخرجاكنزهما رحمة من ربک وما فعلته عن أمري ذلک تأويل مالم تسطع عليه صبرا**''(سورۂ کہف:۸۲)(رہی دیوارتو وہ شہر کے دویتیم بچوں کی تھی، اوراس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ تھا، اوران کے والدین نیک تھے، آپ کے رب نے چاہا کہ وہ بلوغ وجوانی کی عمر کوپہنچ کر اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ آپ کے رب کی رحمت سے ہوا، میں نے اپنے اختیار سے نہیں کیا۔ یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جن پر آپ صبر نہیں کرسکے)۔بعض مفسرین نے دونوں بچوں کے واقعے سے یہ سمجھا ہے کہ خضر علیہ السلام نے اللہ سبحانہ وتعالی کے ارادہ سے دیوار میں تصرف کیا۔ اللہ عزوجل کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ باپ کی صلاح ونیکی کے بدلہ میں ان دونوں یتیموں کے ساتھ مہربانی کی جائے۔اس سلسلہ میں امام ابن عاشورؒ رقم طراز ہیں:''ممکن ہے کہ باپ نے اللہ تعالی سے درخواست کی ہو کہ بالغ ہونے کے وقت ان کے دونوں بچوں کے دل میں اس بات کا احساس پیدا کردے کہ وہ بہ طور قصد یا بہ طور اتفاق دیوار کے نیچے مدفون خزانہ کو تلاش لیں''(۱)۔

درست تدبیر کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ یتیموں کی مصلحت کا تحفظ کیا جائے، چنانچہ ان کی مصلحت کی تحصیل ان کی سماجی اور معاشی زندگی کی نوعیت، اس میں رائج قوانین، دستور، رسم

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۱۶، ص:۱۴۔

ورواج اور سرگرمیوں کی نوعیت کو سمجھنے پر موقوف ہے۔ مثال کے طور پر: نزول قرآن کے وقت زراعت، شکار اور غارت گری ولوٹ کھسوٹ کے اعمال ہی عربوں کے یہاں رائج اقتصادی سرگرمی تھی، جبکہ یہ سارے ایسے اعمال ہیں جو اپنے انجام دینے والے کی موت سے ختم ہوجاتے ہیں۔ اب اگر کوئی آدمی مرجاتا اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاتا تو وہ کمائی نہیں کر پاتے تھے، جیسے ان کے باپ کمائی کرتے تھے۔ مزید برآں اس وقت کی عربی سماجی صورت حال یہ تھی کہ خاندان کے بڑے فرد کو بڑا اقتدار حاصل تھا، جس کے نتیجہ میں مال اسی کے قبضہ میں رہتا تھا؛ کیونکہ ہم بہت کم پاتے ہیں کہ چھوٹے بچہ کے پاس مال ہو۔

اس حقیقت کے مدنظر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عربوں کے نزدیک یتیمی کی صفت کا لازمی عنصر فقر ومحتاجی، نظر اندازی اور ذلت وخواری تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہم اس مقصود کو بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالی اپنے نبی کریم محمد ﷺ پر احسان جتاتے ہیں کہ اس نے یتیمی کی حالت میں یتیموں کو لاحق ہونے والی صورتحال سے ان کی حفاظت فرمائی۔ ارشاد باری تعالی ہے: "**ألم يجدك يتيما فأوى**" (سورۂ ضحیٰ:٦) (کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا، پھر آپ کو پناہ دی)۔

اس طرح اس سماجی دائرہ اور صورت حال میں یتیموں کو ایسے سرپرست کی ضرورت ہے جو ان کی دولت وثروت کی حفاظت کرے اور ان کے مختلف معاملات کی نگہداشت رکھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یتیموں کے مصالح ومنافع پر نظر رکھنے کی دعوت دی ہے۔ فرمان باری تعالی ہے: "**ويسئلونك عن اليتامى قل إصلاح لهم خير، وإن تخالطوهم فإخوانكم والله يعلم المفسدين من المصلح**" (سورۂ بقرہ:٢٢٠) (اور یہ لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں دریافت کررہے ہیں، آپ کہہ دیجئے: ان کی بہتری اور حالات درست کرنے کا جذبہ بہت اچھا ہے، اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ رکھو تو وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح ہے)۔

اسی طرح اللہ تعالی نے ایسے احکام مشروع فرمائے ہیں جو ان مصالح کا تحفظ کرتے

ہیں۔ایک حکم یہ ہے کہ بہتر طریقہ پر ہی یتیموں کے اموال سے قریب ہونا چاہئے، اور ان کی منفعت کی خاطر ہی ان کے مال میں تصرف کیا جائے، اور ان کے مال کی ذمہ داری بہتر طریقہ پر ہی ادا کی جائے۔ارشاد الٰہی ہے:"**ولا تقربوا ما ل اليتيم إلا بالتي هي أحسن**" (سورۂ انعام:۱۵۲)(اور بہتر طریقہ پر ہی یتیم کے مال کے قریب جاؤ، یعنی اس کے مال کے سلسلہ میں اچھی طرح ہی ذمہ داری نبھاؤ)۔

ایک دوسرے موقع سے فرمان باری تعالی ہے:"**إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلما إنما يأكلون في بطونهم نارا وسيصلون سعيرا**"(سورۂ نساء:۱۰)(یقیناً جو لوگ ازراہ ظلم یتیموں کا مال کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں۔اور وہ جہنم میں داخل ہوں گے)۔

اس وعید کی بنا پر لاحق ہونے والے خوف شدید کی وجہ سے کچھ لوگوں نے یتیموں کے اموال میں تصرف کرنے کو چھوڑ دیا اور ان سے الگ تھلگ ہو گئے تھے(۱)۔

یتیموں کے حالات درست کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر وہ عمل کیا جائے جو اعتقادی، تعلیمی، جسمانی، نفسیاتی، مالی اور عقلی لحاظ سے ان کے احوال درست کرے، اسے دیکھتے ہوئے ہم جملہ "**وإن تخالطوهم**"(اور اگر تم ساتھ مل جل کر رہتے ہو) کے استعمال کے اس مقصد کو سمجھ سکتے ہیں، جس کے مطابق ان کو ساتھ رکھنا اور مل جل کر کھانا پینا مطلوب ہے، بس نیت بگاڑ وفساد کی نہ ہو۔چنانچہ شرعی مقصد یہ ہے کہ باہمی رابطہ کے عمل کی تشکیل کی جائے، جس کے ذریعہ یتیموں کی فکری اور مالی صلاحیتوں میں اضافہ وترقی ہو، ان کی مختلف نوعیت کی صلاحیت میں جلا آئے اور ان کی متعدد اہلیتوں اور تخلیقی مہارتوں میں ترقی ہو۔یہ ساری حصولیابیاں اسی وقت ممکن ہیں جبکہ ان کو خاندان، سماج اور اسکے معاشی، سماجی سیاسی اور ثقافتی ڈھانچوں میں ساتھ رکھا جائے۔

۱- اس سلسلے میں بہت سی روایتوں کے لئے دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۲، ص: ۳۵۴۔

تدبیر کی صلاح ودرستگی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان صلح وصفائی کی سعی اس حیثیت سے کی جائے کہ یہ خاندان کو درست رکھنے کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ یہ امر دو آیتوں میں بالکل واضح ہے:

پہلی آیت ہے:''**وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما**''(سورۂ نساء:۳۵)(اگر میاں بیوی کے درمیان سخت نزاع کا اندیشہ ہوتو ایک حکم وثالث شوہر کے خاندان سے اور ایک حکم وثالث بیوی کے خاندان سے بھیج دو، اگر میاں بیوی اصلاح چاہیں گے (اور حکمین وثالثی بھی دل سے حالات درست کرنا چاہیں گے) تو اللہ تعالی ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرمادے گا)۔

راجح یہ ہے کہ آیت میں امر کا صیغہ وجوب کے لئے ہے، اس لئے کہ خاندان کی اصلاح اور اس کے حالات درست کرنا، ان قرآنی مقاصد میں سے ہے جنہیں متعدد آیتوں سے تقویت حاصل ہے، فرمان باری تعالی ہے:''**لا خير في كثير من نجواهم إلا من أمر بصدقة أومعروف أو إصلاح بين الناس**''(سورۂ نساء:۱۱۴)(لوگوں کی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے، مگر جو (چپکے سے) صدقہ وخیرات کا حکم دے، یا نیکی وبھلائی کی بات کرے، یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرانے کی بات کرے)۔ نیز فرمان باری تعالی ہے:''**إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم**''(سورۂ حجرات:۱۰)(مومن تو بھائی بھائی ہی ہیں، لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح کرادیا کرو)۔

دوسری آیت ہے:''**وإن امرأة خافت من بعلها نشوزا أو إعراضا فلا جناح عليهما أن يصلحا بينهما صلحا والصلح خير**''(سورۂ نساء:۱۲۸)(اگر کسی خاتون کو اپنے شوہر کی طرف سے ترفع یا اعراض وبے رغبتی کا اندیشہ ہو، تو ان دونوں کے حق میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ باہم صلح کرلیں، اور صلح ہی بہتر ہے)۔

''الصلح'' میں الف لام جنس کے لئے ہے اور'' عہد خارجی'' کے لئے نہیں ہے، اس

لئے کہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ صلح کی ماہیت وحقیقت لوگوں کے لئے بہتر ہے، یہ مقصود نہیں ہے کہ ''خلع کرانا'' میاں بیوی کے درمیان نزاع جاری رہنے سے بہتر ہے۔ مقصود تو یہ ہے کہ عمومی طور پر صلح خواہ اس کا میدان کچھ بھی ہو، اور اس کا موضوع کسی قسم کا ہو، ہمیشہ اس میں خیر و بھلائی اور منفعت ہے۔ امام محمد طاہر بن عاشورؒ رقم طراز ہیں: ''اس آیت نے تین تاکیدی امور کے ذریعہ صلح کی شدید ترغیب دی ہے، وہ تینوں تاکیدی امور یہ ہیں: ۱- ''صلحا'' تاکیدی مصدر ہے، ۲- ''والصلح خیر'' (اور صلح بہتر ہے) میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو لایا گیا ہے، اور ۳- ''الصلح'' کی خبر مصدر یا صفت مشبہ کو بنایا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی فطری عمل ہے''(۱)۔

تدبیر کی صلاح ودرستگی کی ایک شکل یہ ہے کہ نگراں اور ذمہ دار مردوں کے پہلو میں نیک خواتین بھی ہوں؛ کیونکہ درج ذیل فرمان الٰہی کے سیاق میں خواتین کو صلاح و نیکی سے متصف کیا گیا ہے: ''**الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبمآ أنفقوا من أموالهم فالصالحات قانتات حافظات للغيب بما حفظ الله**'' (سورۂ نساء: ۳۴) (مرد عورتوں پر نگراں وذمہ دار ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دے رکھی ہے، نیز اس بنا پر بھی کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں، چنانچہ نیک خواتین اطاعت شعار ہوتی ہیں اور شوہروں کی غیر موجودگی میں اللہ تعالی کی نگہداشت وحفاظت کے سہارے ان کے مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں)۔

چنانچہ صفت صلاح ونیکی کی بنیاد پر خواتین کو یہ استحقاق حاصل ہوا کہ ان کے حالات کی تفصیل کی جائے، جیسے: مردوں کو خواتین کے سرپرست وذمہ دار ہونے کی بنا پر فضیلت کا استحقاق ہے، فرمان الٰہی: ''**فالصالحات**'' کے اندر فاء فصیحہ ہے۔ یعنی جب مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں تو یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ شادی شدہ عورتوں کے احوال کی تفصیل کردی جائے... ان احوال میں سے ایک ''صلاح'' کی صفت بھی ہے(۲)۔

۱- مرجع سابق، ج۵، ص: ۲۱۷۔ ۲- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۵، ص: ۴۰۔

''تدبیر کی صلاح ودرستگی'' کی ایک شکل یہ ہے کہ وصیت، اوقاف اور ذمہ داریوں کے سلسلہ میں حقوق کا تحفظ کیا جائے، اور ان کو ضائع ہونے کی زد میں نہیں لایا جائے۔ فرمان باری تعالی ہے:''**فمن خاف من موص جنفا أو إثما فأصلح بينهم فلا إثم عليه إن الله غفور رحيم**''(سورۂ بقرہ:۱۸۲)(جسے وصیت کرنے والے کی طرف سے جانبداری یا زیادتی محسوس ہو، اور وہ وارثین کے درمیان صحیح طریقہ پر میراث کی تقسیم کردے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، یقیناً اللہ تعالی بخشنے والا اور مہربان ہے)۔

تدبیر کی صلاح ودرستگی کی ایک شکل یہ ہے کہ مسلسل ایسے مصالح اپنائے جائیں جن سے انسانوں کو نفع پہنچے۔ یہ وہ قطب نما یا مرکزی نقطہ ہے جس سے اسلامی مفکر اور فقیہ کی رفتار اور رخ کا تعین ہوتا ہے۔ یہ ایک اصولی چیز ہے، خواہ معاملہ کا تعلق اللہ تعالی کے نام سے کھائی ہوئی قسم کو پورا کرنے سے ہو، یا اللہ تعالی کے نام کے ساتھ ادب اختیار کرنے سے ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:''**ولا تجعلوا الله عرضة لأيمانكم أن تبروا وتتقوا وتصلحوا بين الناس**'' (سورۂ بقرہ:۲۲۴)(اور تم اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ مت بناؤ (کہ اپنی نامناسب قسموں کے ذریعہ) نیکی کرنے، تقوی وپرہیزگاری اختیار کرنے اور لوگوں کے درمیان صلح وصفائی کرانے سے (اجتناب کرنے لگو)۔

اسی وجہ سے یہ مقولہ مشہور ومعروف ہے:''**الامتثال مقدم على الأدب**''(ادب پر حکم کی تعمیل مقدم ہے)۔

اسی اساس پر ہم رسول کریم ﷺ کی سنت کو سمجھ سکتے ہیں، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:''میں جب بھی کوئی ایسی قسم کھاتا ہوں، جس کے علاوہ میں زیادہ بہتری ہوتی ہے تو میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کردیتا ہوں، اور جو زیادہ بہتر عمل ہوتا ہے، اسے انجام دیتا ہوں''(۱)۔

۱- ابوداؤد، سنن ابی داؤد، مرجع سابق، کتاب:الایمان والنذور، باب:''الرجل یکفر قبل أن یحنث''، ج۲،ص:۲۴۸،حدیث نمبر:۳۲۷۶۔

اللہ تعالی کے ساتھ ادب اختیار کرنا ایک ایسی مصلحت ہے جو کہ مطلوب ومقصود ہے، اس سے اللہ عزوجل کے نام کی تعظیم ہوتی ہے، اسی طرح خلق الٰہی کو نفع پہنچانا ایسی مصلحت ہے جو مطلوب ہے کہ لوگ اپنے مصالح کو انجام دیتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں مصلحتیں اس واقعہ میں متصادم ہیں جو ایوب علیہ السلام کو اپنی بیوی کے ساتھ پیش آیا۔ اس وقت اللہ رب العزت نے ان کو اپنی قسم پوری کرنے کا حکم نہیں دیا کہ وہ اپنی بیوی کو سو کوڑے لگائیں، بلکہ انہیں اس بات کی ہدایت کی کہ سو تیلیوں پر مشتمل ڈنڈا لیں اور اس سے اپنی بیوی کو مار دیں (اس طرح ان کی قسم پوری ہوجائے گی اور بیوی کو شدید ضرر بھی لاحق نہ ہوگا)۔ چنانچہ مار کے ذریعہ قسم کو پوری کرنے سے عظیم وبرتر اللہ کے نام کے ساتھ ادب اختیار کرنے کی مصلحت پوری ہوتی ہے، لیکن خلق الٰہی کو ضرر لاحق ہوتی ہے، جسے اللہ عزوجل نے پسند نہیں کیا، اور اپنے نبی ایوب علیہ السلام کو ایک ایسی راہ کی رہنمائی کی، جس کے ذریعہ ان کی قسم بھی پوری ہوجائے گی، اور ان کو اور ان کی بیوی کو اذیت بھی لاحق نہ ہوگی۔ امام ابن عاشورؒ رقم طراز ہیں: ''یہ قسم پوری کرنے کا ایک طریقہ ہے جس کا فتوی خود اللہ تعالی نے اپنے نبی کو دیا۔ شاید ان کی شریعت میں کفارہ مشروع نہیں تھا۔ کفارہ کی مشروعیت اسلام کی عطا کردہ سہولت وآسانی ہے۔ اللہ عزوجل نے ہمیں یہ سہولت دی ہے؛ کیونکہ اس نے کفارہ کے ذریعہ قسم سے نکلنے کو مشروع قرار دیا ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی نقطہ نظر سے یہ کافی نہیں ہے کہ قسم کھانے والا وہ کام کرے جو ایوب علیہ السلام نے کیا تھا''(۱)۔

''تدبیر کی صلاح ودرستگی'' کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ دوسرے کے حق میں کھلے پن کا مظاہرہ کیا جائے اور توسع اختیار کیا جائے، جیسے: آپس کے تعلقات درست کرنے کی سعی وکاوش کی جائے، فرمان باری تعالی ہے: ''**فاتقوا الله وأصلحوا ذات بينكم**''(سورۂ انفال:۱) (سو اللہ سے ڈرتے رہو اور آپس کے تعلقات کو درست کرو)۔

ہم اس اہمیت کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں جو قرآن کریم نے آپس کے تعلقات کی

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۲، ص:۳۸۰۔

اصلاح کرنے کو دی ہے، بالخصوص سنگین اور مشکل بھرے اوقات میں، جن میں سے جنگ کے اوقات بھی ہیں، اس لئے کہ اس اصلاح کا نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ایسا فتنہ برپا ہوگا جو سماجی ادارہ کے تمام افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، یعنی اس فتنہ کے شرور ومفاسد صرف ظالم افراد کو ہی لاحق نہیں ہوں گے، بلکہ اس کے اثرات دوسروں تک بھی پہنچیں گے۔ فرمان باری تعالی ہے:"**واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة واعلموا أن الله شديد العقاب**"(سورۂ انفال:۲۵)(اس عذاب سے ڈرو جو تم میں سے صرف ظالموں کو ہی لاحق نہ ہوگا بلکہ دوسرے لوگ بھی اس کی چپیٹ میں آئیں گے) اور اس حقیقت کو اچھی طرح جان لو کہ اللہ تعالی سخت عذاب دینے والا ہے)، ایک دوسرے مقام پر ارشاد الٰہی ہے:"**والذين كفروا بعضهم أولياء بعض إلا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد كبير**"(سورۂ انفال:۷۳)(اور جو کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق وحمایتی ہیں، اگر تم ایسا نہیں کرتے ہو (ان کی دوستی سے باز نہیں آتے ہو) تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا)۔

اسی وجہ سے اللہ تعالی نے اہل ایمان کے درمیان اصلاح کرانے کا حکم دیا ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:"**إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم**"(سورۂ حجرات:۱۰)(مؤمن تو بھائی بھائی ہیں، لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح وصفائی کرا دیا کرو)۔ بلکہ قرآن مجید نے لوگوں کے درمیان صلح وصفائی کرانے کے معاملات میں سرگوشی کے خیر کے پہلو کو منحصر کر دیا ہے۔ فرمان باری تعالی ہے:"**لاخير في كثير من نجواهم إلا من أمر بصدقة أو معروف أو إصلاح بين الناس**"(سورۂ نساء:۱۱۴)(لوگوں کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے، مگر یہ کہ کوئی (چپکے) سے خیر وخیرات کا حکم دے، یا نیکی وبھلائی کی بات کرے، یا لوگوں کے درمیان صلح وصفائی کرانے کی بات کرے)۔

''تدبیر کی صلاح ودرستگی'' کی ایک شکل یہ ہے کہ نادانوں کو مال میں تصرف کرنے میں اسراف وتبذیر اور فضول خرچی سے روکا جائے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**ولا تؤتوا السفهاء**

أموالكم التي جعل الله لكم قياما"(سورۂ نساء:۵)(تم اپنے اموال جن کو اللہ تعالی نے زندگی کی بقا اور قائم رہنے کا ذریعہ بنایا ہے، نادانوں کو مت دو)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ہی اموال پر اللہ تعالی نے لوگوں کی معیشت، اسباب زیست اور مصالح کا دارومدار رکھا ہے(۱)۔

قرآن مجید میں وارد" تدبیر کی صلاح ودرستگی" کے مظاہر کے ہمارے استقراء وچھان بین سے یہ بات نکلتی ہے کہ" تدبیر کی صلاح" کی لڑیاں زمینی اصلاح کے عنصر میں پروئی ہوئی ہیں، اس لئے کہ خلیفہ بنائے گئے انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ روئے زمین کو درست رکھے، نہ کہ اس میں بگاڑ وفساد پیدا کرے۔زمین کی اصلاح اس طرح ہوگی کہ انسان کو تیار کیا جائے تا کہ وہ فرمان الہی کی صراحت کردہ خلافت کے وظائف و اعمال اور ذمہ داریوں کو انجام دے سکے"وإذ قال ربک للملائكة إني جاعل في الأرض خليفة"(سورۂ بقرہ:۳۰)(اوراس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں خلیفہ مقرر کروں گا)۔

یہ سب ایسے مظاہر ہیں جن کے اندر زمینی اصلاح کے ثمرات وفوائد بالکل عیاں ہیں اور بالعموم یہ سب زمینی وراثت، پاکیزہ زندگی اور اہل صلاح سے لوگوں کی محبت میں ظاہر وباہر ہیں۔

فرمان باری تعالی میں زمین کی وراثت کا ثمرہ نمایاں ہے:"ولقد كتبنا في الزبور من بعدالذكر أن الأرض يرثها عبادي الصالحون"(سورۂ انبیاء:۱۰۵)(ہم نے نصیحت و یاددہانی کے بعد زبور میں لکھ رکھا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیک وصالح بندے ہی ہوں گے)۔اہل ایمان میں سے نیک وصالح بندے جس زمین کے وارث ہوں گے، اس سے مقصود مفہوم کے تعین میں مفسرین کا اختلاف ہے۔بعض مفسرین کہتے ہیں: یہ جنت کی زمین ہے۔جبکہ بعض دیگر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ دنیا ہی کی زمین ہے۔کچھ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ یہ وہ زمین ہے جس کا وعدہ اللہ تعالی نے بنواسرائیل سے کیا تھا۔اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"وأورثنا القوم

۱- اس پہلو کی مزید معلومات کے لئے دیکھئے: رضا، الوحي المحمدي، مرجع سابق، ص:۲۹۶۔

الذين كانوا يستضعفون مشارق الأرض ومغاربها التي باركنا فيها وتمت كلمت ربک الحسنى على بنى اسرائيل بما صبروا ودمرنا ماكان يصنع فرعون وقومه وما كانوا يعرشون''(سورۂ اعراف:۱۳۷)(جوقوم کمزور سمجھی جاتی تھی اسے ہم نے اس زمین کے مشرق ومغرب یعنی سارے اطراف وجہات کا وارث و مالک بنادیا، جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا ہے، اور بنواسرائیل کے حق میں تیرے رب کا سچا وعدہ ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہوکر رہا۔ اور ہم نے فرعون اور اس قوم کی بنائی ہوئی ہر چیز یعنی بلند و بالا عمارتوں اور محلوں اور ان باغات کو جن پر بیلیں چڑھی ہوتی تھیں، تباہ و برباد اور تہس نہس کردیا)۔

بعض مفسرین نے امام ابن جریر طبری کی ذکر کردہ تینوں آراء کے درمیان تطبیق کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کی رائے کے مطابق جنت کی زمین آخرت میں یہ مومنین کا حصہ ہے؛ کیونکہ دنیا کے اندر وہ صلاح و اصلاح کے لئے کمر بستہ رہے، خواہ دنیا میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہو یا نہیں، جیسے: ان کے تصدیق سے خارج اسباب کی بنا پر کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی ہے تو کبھی ذاتی اسباب، مثلاً: دل کے صحیح وسالم نہ ہونے کی وجہ سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی ہے۔ لیکن لفظ ''ارض'' (زمین) کو مطلق رکھنے میں بہ قول امام ابن عاشورؒ: ''اس بات کی مناسب دلیل موجود ہے کہ یہ مراد لیا جائے کہ دنیا کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا جب تک وہ ایمان اور صلاح ونیکی اور اصلاح پر استقامت اختیار کریں گے''(۱)۔

پاکیزہ زندگی کا ثمرہ وہ ہے جسے فرمان باری تعالی میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:''**من عمل صالحا من ذكرأو أنثى وهو مؤمن فلنحيينه حيوة طيبة**''(سورۂ نحل:۹۷)(جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، اسے ہم پاکیزہ زندگی عطا کریں گے)۔

پاکیزہ زندگی کا مفہوم: اچھی وعمدہ زندگی ہے جس کی نمایاں خصوصیات: اللہ عزوجل کی

۱- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج۱۷، ص:۱۶۲۔

تقسیم کردہ روزی پر راضی رہنا، انجام کی اچھی امید، صحت وتندرستی، دل کے اندر اسلام کا غلبہ اور لوگوں کی محبت ہے.....مثال کے طور پر لوگوں کی محبت کی دو نمایاں صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ مومن کو اپنے اہل ایمان بھائیوں کے ساتھ شدید محبت ہو، اس لئے کہ باہمی محبت ہی اہل ایمان کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات میں حاوی رہنا چاہئے؛ کیونکہ ان کے بارے میں یہی بات طے ہے کہ وہ محبت کرنے والے بھائی بھائی بن کر رہیں۔فرمان باری تعالی ہے:''**وألف بين قلوبهم لو أنفقت ما في الأرض جميعا ما ألفت بين قلوبهم**''(سورۂ انفال:۶۳)(اور اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا اور ان کے اندر الفت پیدا کردی، اگر آپ زمین کی ساری دولت اور خزانے بھی خرچ کر ڈالتے تو ان کے دلوں میں محبت پیدا نہیں کرسکتے تھے)۔نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:''**خير الناس أنفعهم للناس**.....''(لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے)(۱)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مومن کی شخصیت میں اس قدر جاذبیت ہو جو جاہ ومنصب اور مالی، معاشی، سیاسی اور سماجی پوزیشن کے برابر یا زائد ہو۔قرآن مجید نے اسے محبت سے تعبیر کیا ہے، ارشاد الہی ہے:''**سيجعل لهم الرحمن ودا**''(سورۂ مریم:۹۶)(اللہ رحمٰن ان کو محبوبیت

۱- یہ الفاظ حدیث نبوی ﷺ:''**خير الناس من ينفع الناس**''(لوگوں میں بہتر وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے) سے ماخوذ ہیں۔یہ ایسی روایت ہے جس کے بارے میں شیخ عجلونی نے کہا: مجھے معلوم نہیں کہ کس نے بیان کیا ہے کہ یہ حدیث ہے کہ نہیں.....لیکن اسکا مفہوم صحیح ہے''، دیکھئے: عجلونی، اسماعیل بن محمد، ''کشف الخفاء ومزیل الإلباس عما اشتہر من الأحادیث علی ألسنۃ الناس، تحقیق: عبد الحمید بن احمد بن یوسف بن ہنداوی، صیدا، المکتبہ العصریہ، ط:۱، (۱۴۲۰ھ/۲۰۰۰ء)، ج۱،ص:۴۵۰-نیز درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہیں:''مومن انسیت رکھنے والا ہوتا ہے، دوسرے بھی اس سے انسیت رکھتے ہیں، اس میں کوئی بہتری نہیں جو مانوس نہ ہو اور دوسروں کو مانوس نہ کرے۔لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے''۔دیکھئے: بدران، عبد القادر بن احمد، تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، بیروت، دار المسیرہ، (۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء)، ج۳،ص:۲۲۔

متقی ہندی، علاء الدین علی بن حسام الدین، کنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، تحقیق: بکری حیانی وصفوہ السبقا، بیروت: مؤسسۃ الرسالہ، ط:۵ (۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء)، ج۱۶،ص:۱۲۸، حدیث نمبر:۴۴۱۵۴۔

سے نوازے گا)۔یعنی اللہ تعالی نیک اہل ایمان کو دوسرے لوگوں کی نگاہ میں محبوب بنادے گا،اور خود اہل ایمان کے دل میں بھی ان کی محبت ڈال دے گا،فرمان الٰہی:"إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات سيجعل لهم الرحمن ودا" (سورۂ مریم:۹۶)(یقیناً جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اللہ رحمان ان کو محبوبیت سے نوازے گا)۔اس کی تشریح ووضاحت کرتے ہوئے زمخشریؒ تحریر فرماتے ہیں:ان کے دلوں میں محبت پیدا فرمادے گا،اور ان کی طرف سے اظہار محبت کئے بغیر ان کے لئے دلوں کے اندر محبت کی آبیاری فرمائے گا،انہیں ان اسباب کو اختیار کرنا نہیں پڑے گا،جو محبت پیدا کرتے ہیں،اور لوگ ان کے ذریعہ دلوں کی محبت حاصل کرتے ہیں، جیسے:رشتہ،دوستی،کسی خصوصیت سے اتصاف،یا اس کے علاوہ دیگر اسباب لیکن یہ مستقل طور پر اللہ عزوجل کی طرف سے پیدا کی جائے گی،یہ اللہ سبحانہ کی طرف سے اپنے دوستوں کا مخصوص اعزاز ہے،جس طرح ان کے اور ان کے مقام ومرتبہ کی خاطر اللہ رب العزت ان کے دشمنوں کے دل میں رعب ڈال دیتا ہے اور ان کی دھاک بٹھادیتا ہے(۱)۔

اگر ہم ''تدبیر صالح'' کے گذشتہ مظاہر پر غور کریں گے تو ان کو زمین کی آبادکاری اور عبادت کے مفاہیم سے ہم آہنگ پائیں گے،جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:"وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون" (سورۂ ذاریات:۵۶)(ہم نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے)،نیز ارشاد الٰہی ہے:"واستعمركم فيها" (سورۂ ہود:۶۱)(اور اسی نے زمین میں تمہیں آباد کیا ہے)۔مفسرین کے نزدیک آبادکاری اور عبادت کے مفہوم پر مبنی اصلاحی دلالتیں حصر سے باہر ہیں۔

اصلاحی دلالت کی ایک صورت وہ ہے جو فرمان باری تعالی:"واستعمركم فيها" (اور اسی نے زمین میں تمہیں آباد کیا) کے سلسلے میں علامہ آلوسیؒ نے بیان کیا ہے،وہ لکھتے

۱- زمخشری، الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل وعيون الأقاويل في وجوه التأويل،مرجع سابق،ج۴، ص:۶۰-۶۱۔

ہیں: اللہ تعالی نے تمہیں رہائش پذیر اور اسے آباد کرنے والا بنایا ہے، چنانچہ ''استفعال''، ''افعال'' کے معنی میں ہے، بولا جاتا ہے: ''أعمرته الأرض'' (میں نے اسے زمین میں آباد کیا)، یعنی اللہ عزوجل نے تمہیں ضروریات کی چیزوں کی تعمیر اور آبادکاری کا حکم دیا، جیسے مکانات کی تعمیر، نہروں کی کھدائی اور پودے لگانے اور دیگر ضروریات کو قائم کرنے کا حکم دیا(۱)۔

قرطبیؒ نے زید بن اسلمؒ سے بھی اسی کو نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''یعنی اللہ تعالی نے تمہیں اپنی ضروریات کی آبادکاری کا حکم دیا، یعنی مکانات کی تعمیر کرو، اور پودے لگاؤ''(۲)۔

اصلاحی دلالت کی ایک دوسری صورت وہ ہے جو آیت کریمہ ''**وماخلقت الجن**.....'' (میں نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) کی تشریح کرتے ہوئے امام ابن عاشورؒ تحریر فرماتے ہیں: ''اللہ عزوجل مطلقا ہر طرح سے بے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، اس نے اپنے نفع کے لئے مخلوق کو پیدا نہیں کیا ہے، لیکن اسے کائنات کی آبادکاری اور عبادت کے مفہوم میں شامل شریعت کی پیروی کے ذریعہ آبادکاری کے نظام کو جاری کرنے کے لئے پیدا کیا ہے''(۳)۔

نیز آیت کریمہ: ''**واستعمر کم فیها**'' (اس نے زمین میں تمہیں آباد کیا) میں بھی ''استعمار''، ''اعمار'' کے معنی میں ہے، یعنی اللہ تعالی نے تمہیں زمین کو آباد کرنے والا بنایا۔ آبادکاری کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں نے زمین کو عمارتوں، پودے، درخت اور کھیتی سے آباد کر رکھا ہے، اس لئے کہ یہ سارے اعمال زمین کی آبادکاری شمار ہوتے ہیں، حتی کہ کھیتی کرنے کو بھی آباد کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے کہ کھیتی سے بھی زمین آباد ہوتی ہے''(۴)۔

۱- آلوسی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، مرجع سابق، ج ۱۲، ص: ۸۸۔
۲- قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۹، ص: ۵۶۔
۳- ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۲۷، ص: ۲۹۔
۴- مرجع سابق، ج ۱۲، ص: ۱۰۸۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ مظاہر اصلاح سے ان اقدار(۱) کی تشکیل کی نوعیت معلوم ہوتی ہے جو دین اسلام کا ہدف ہیں، اور جن کو رسول کریم محمد بن عبداللہ ﷺ نے اپنے جامع الفاظ میں یوں بیان کیا ہے: ''میری بعثت کا مقصد حسن اخلاق کی تکمیل ہے''(۲)۔

اقدار کی یہ تشکیل جس قدر کسی عمل پر انسان کے اقدام کی تشریح کرتی اور وجہ جواز فراہم کرنے والے محرک کو بتاتی ہے، اسی قدر اس کا مطلب مصلحت پر مبنی متعدد اوصاف ہیں، جن کے ذریعہ ہم انسانی اعمال میں سے کسی عمل کو متصف کرتے ہیں۔ مصلحت پر مبنی ان اوصاف کے اندر سب سے اہم ان کا اخلاقی پہلو ہے جو ہر صلاح ونیکی کی اصل ہے، اور ہر مصلحت کی اساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اس اقداری عمارت کی تشکیل اور اس کے عملی تقاضے کے مطابق استقامت پر لوگوں کی تربیت کرنے پر بہت زیادہ آمادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی متعدد آیات ہیں، ایک آیت میں فرمان باری تعالی ہے: ''**قل إنما أنا بشر مثلكم يوحى إلى أنما إلهكم إله واحد فمن كان يرجو لقاء ربه فليعمل عملا صالحا ولا يشرك**

۱- لفظ ''قیمت'' عربی زبان میں قدر (Value) یا کسی چیز کی معنوی مقدار کو کہتے ہیں، یا کسی سامان اور تجارتی شے کی مادی یا مالی رقمی ثمن کو کہتے ہیں، میدان استعمال کے اعتبار سے بھی جن میں لفظ ''قیمت'' استعمال ہوتا ہے، اصطلاحی لحاظ سے متعدد معانی کے لئے آتا ہے، علم معاشیات کے اندر یہ لفظ دولت وثروت کی مالی قدر (Value) پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ ماہرین معاشیات پیداواری قیمت اور استعمالی قیمت میں فرق وامتیاز کرتے ہیں۔ فلسفیانہ میدان میں ''قیمت'' اخلاقی قدر کو بتاتی ہے، جسے اس بات کا استحقاق ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود کے ساتھ اسے اختیار کرے اور اس کے تقاضے کے مطابق اپنے افعال واعمال کو انجام دینے کی سعی وکاوش کرے۔ مزید معلومات کے لئے دیکھئے: قصوہ، صلاح، ''نظرية القيمة في الفكر المعاصر''، قاہرہ، دار الثقافہ للنشر والتوزیع، ۱۹۸۱ء، ص:۶-عبدالرحمٰن، طہ ''تعدد یہ القیم مامداہا؟ وما حدودہا؟''، مجلّہ قضایا اسلامیہ معاصرہ، شمارہ ۲۰-۲۱، ۲۰۰۲ء، ص:۲۳۱۔

۲- اصبحی، ابوعبداللہ مالک بن انس، موطأ، تحقیق: محمد فؤاد عبدالباقی، قاہرہ، دار احیاء التراث العربی، (د، ت)، کتاب حسن الخلق، ج ۲، ص: ۹۰۴، حدیث نمبر: ۱۶۰۹۔ سیوطی کی ''جامع صغیر'' کے الفاظ ہیں: ''میری بعثت کا مقصد مناسب وموزوں اخلاق کی تکمیل ہے''۔ شاطبیؒ بڑے باتوفیق تھے، انہوں نے فرمایا: ''پوری شریعت اعلی وعمدہ اخلاق کو اختیار کرنے کا نام ہے''، دیکھئے: شاطبی، الموافقات فی اصول الشریعۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص: ۷۷۔

بعبادة ربه أحدا''(سورۂ کہف:۱۱۰)(آپ کہہ دیجئے: میں تو بس تمہارے ہی طرح ایک انسان ہوں، میرے پاس وحی نازل کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہے، سو جو اپنے رب سے ملنے کا امیدوار ہو، وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے)(۱)۔

یقیناً قرآن کریم میں وارد عمل صالح ایک اخلاقی اقداری عمل ہے، جس کی صورت گری تین پہلوؤں میں ہوتی ہے: ۱-عمل کا نفسانی پہلو، ۲-عمل کا بدنی پہلو، اور ۳-عمل کا تدبیری پہلو۔ یہ سب کے سب ایسے پہلو ہیں جن کی اہمیت وعظمت مخفی نہیں ہے، بالخصوص جبکہ ہم انانیت وگھمنڈ کی تباہ کن آفتوں اور عیوب کی بنا پر انانیت کی اخلاقیات کے خطرہ سے دوچار ہیں، یہ ایسی اخلاقیات ہیں جن کے حاملین کو صرف انفرادی مصلحت اور اپنی ذات کی محبت سے سروکار ہوتی ہے۔

۱- اس پہلو کی مزید معلومات کے لئے دیکھئے: حسنی، اسماعیل، ''الاختلاف والتفکیر فی القرآن الکریم''، قاہرہ، دارالسلام، ط:۱(۱۴۳۶ھ/۲۰۱۵ء)، ص:۱۶۲۔

خاتمہ

اصلاح کے اسباب کے حصر اور اس کے مظاہر کے انضباط کے ذریعہ اصلاح کے مفہوم کے سلسلے میں جو بحث کی گئی، اس کے نتیجے میں متعدد حقائق تک میں پہنچا ہوں، ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں:

۱-اصلاح کا وہ مفہوم جس پر قرآن مجید مشتمل ہے اس ثمرہ کے درجہ میں ہے جو ''تدافع'' اور ''توسط'' سے پیدا ہوتا ہے۔ اس ثمرہ کے اعتقاد، تفکیر اور عمل کے اندر کئی مظاہر ہیں۔ ان اسباب اور مظاہر کے پیش نظر ہم قرآن مجید میں وارد اصلاح کے مفہوم کی متعین تعریف پیش کر سکتے ہیں۔

۲-اصلاح کے مفہوم کی باحثین اور علماء کی پیش کردہ زیادہ تر تعریفات کو دو اساسی سطح پر حاوی ہونے کی ضرورت ہے، جن کا یہ مفہوم احاطہ کئے ہوئے ہے: اسباب کی سطح، جن سے صلاح و نیکی تک رسائی ہوتی ہے، یا وہ اسباب فساد و بگاڑ تک پہنچاتے ہیں۔ مظاہر کی سطح، جن کے اندر صلاح و فساد میں سے ہر ایک کی جلوہ گری ہوتی ہے۔

۳-ان دونوں سطحوں کی چھان بین سے ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ قرآن مجید میں وارد اصلاح مظاہر اور اسباب کا مرکب ڈھانچہ ہے۔ چنانچہ ''اصلاح'' اعتقادی، تفکیری اور عملی مظاہر سے مرکب ڈھانچہ ہے۔ مظہر اصلاح اعتقاد سے اس کے ٹھوس اور مستحکم مرکز کی تشکیل ہوتی ہے، اس لئے کہ اسی سے تفکیری اور عملی اصلاح کے مظاہر نکلتے ہیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اعتقاد، تفکیر اور عمل کی اصلاح ایسے ممتاز مظاہر ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے، ہاں، اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن یہ مظاہر باہم مربوط بھی ہیں، اس لئے کہ

تفکیری اصلاح جب عملی اصلاح کی اساس و بنیاد ہے، تو اعتقادی اصلاح تفکیری اصلاح کی اساس ہے، لہذا اعتقادی اصلاح تفکیری اور عملی دونوں اصلاحوں کی بنیاد ہے۔

۴-اعتقادی اصلاح ایسی ذہنیت کو مستحکم کرتی ہے جو دلیل کی طرف مائل رہے۔ اس کی بنا پر ایسی ذہنیت کے حامل کی سوچ غور وفکر، تحقیق، موضوعیت اور دلائل سے لبریز ہوتی ہے۔

عملی اصلاح کی متعدد شکلیں ہیں: ایک شکل نفسانی ہے جس کی توجہ قرآنی اعلی اخلاق کی روشنی میں باطنی اخلاق اور داخلی انفعالات واحساسات کے تزکیہ کی طرف رہی ہے۔

ایک دوسری شکل جسمانی ہے جو اپنے اعضاء وجوارح کے اعمال کے ساتھ ایک طرف انسان کی جسمانی سلامتی کی خدمت کی طرف متوجہ رہتی ہے، تو دوسری طرف قرآنی احکام اور تعلیمات کے ساتھ مثبت طور پر ہم آہنگ رہنے کی طرف بھی متوجہ رہتی ہے۔

ایک تیسری شکل تدبیری ہے جس کا مقصد متعدد مصالح کی تحصیل اور اس کی ضد مفاسد کا ازالہ ہے۔

۵-قرآنی اصلاح کے مظاہر اسباب ومظاہر کے ایسے مستحکم ومربوط ڈھانچہ وقالب میں پیوست ہیں، جو اسی طرح مستحکم ہے جیسے امراض سے صحیح وسالم اور تندرست جسم مستحکم ہوتا ہے۔ جس طرح یہ جسم مرض کی زد میں ہے، جب بھی اس کے قالب اور استحکام کو تباہ کرنے والا عنصر پایا جائے گا تو وہ اس کی زد میں آجائے گا، اسی طرح قرآن مجید میں وارد مطلوب ومقصود اصلاح بھی فساد کی زد میں ہے، جبکہ اس کے مظاہر واسباب کے ڈھانچہ میں اعتقادی، یا تفکیری یا عملی فساد وبگاڑ کے عناصر میں سے کوئی عنصر نفوذ کر جائے، ایسی صورت میں وہ انتہا پسندی، یا جمود یا تناقض کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

۶-اسباب پر مبنی دراسہ وتحقیق سے وہ کیفیت معلوم ہوجاتی ہے، جس کے دائرہ میں قرآن مجید نے اصلاح کے قضیہ کو پیش کیا ہے، یا پیش کرتا ہے۔ اصلاح کا عمل ایک ایسا نتیجہ ہے جو اس منہجی سلوک وبرتاؤ سے برآمد ہوتا ہے جس کی بنیاد جمود وانتہا پسندی کے مقابلہ میں تدافع اور

توسط پر ہے، اسباب پر مبنی اس تعلق کے مدنظر ''اصلاح'' کا یہ عمل ایک ایسا انسانی عمل ہے جو مرکب ہے اور بالعموم اسکے اندر تقصیر وکوتاہی اور نقص وکمی درآتی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے صالحین اور نیکوکاروں کو مخاطب بنانے کے ضمن میں اللہ عزوجل کی طرف رجوع کرنے کی صفت کو بیان کیا ہے، فرمان باری تعالی ہے: ''**ربكم أعلم بما في نفوسكم إن تكونوا صالحين فإنه كان للأوابين غفورا**'' (سورۂ اسراء:۲۵) (تمہارا رب تمہارے دلوں کی باتوں کا خوب علم رکھتا ہے، اگر تم نیکوکار ہوگے تو وہ (اپنی طرف) رجوع کرنے والوں کو بخشنے والا ہے)۔ اس قسم کی کوتاہی اور نقص وکمی کے مدنظر اصلاح کے ڈھانچہ کی صورت حال کو سمجھ سکتے ہیں، اس لئے کہ اس ڈھانچہ کی تاریخ پر متعدد تجربات ہو چکے ہیں، جن کے دوران یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اللہ تعالی نے نبیوں اور رسولوں کا ایک سلسلہ بھیجا، جنہوں نے درست باتوں کی طرف لوگوں کی رہنمائی کی، اور نامناسب اور غلط باتوں سے خبردار کیا۔

۷- قرآن مجید میں وارد اصلاح کے مفہوم کے منہجی فہم کے بہترین شاہد کو معاصر صورت حال پیش کرتی ہے۔ چنانچہ موجودہ وقت میں مالی، سماجی، انتظامی، سیاسی اور اخلاقی فساد و بگاڑ ایک ایسا فساد ہے جو معاشرہ اور اسکے مختلف اداروں میں پھیلی ہوئی مجرمانہ صورت حال کے ساتھ مربوط ومنسلک ہے۔ فساد صرف رشوت، مال عام، یعنی پبلک سیکٹر کے مال کی چوری، حساب وکتاب میں خرد برد، کسٹمر اور خریدار کے ساتھ دھوکہ دہی، ظلم وستم اور فاسد اعمال کی دیگر قسموں میں ہی منحصر نہیں ہے۔ بلکہ فساد: رذائل، شرور، برائی اور دھوکہ دہی کی صفات سے مرکب ایک ڈھانچہ ہے جو معاشرہ اور اسکے اقدار کو تباہ وبرباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ ڈھانچہ جب ذہنوں اور عقلوں میں پیوست ہو جاتا ہے، تو فساد کا عادی اور رسیا ہونا ایک سنت، یا زندگی کا طریقہ اور مالی، اقتصادی اور سیاسی معاملات کا ایک نہج بن جاتا ہے۔

۸- ہماری تاریخ میں فساد کا ایک انبار ہونے کی وجہ سے فساد ایک ایسا منہج بن گیا ہے کہ اس کا مقابلہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے اسے اس طرح سمجھا جائے کہ وہ ایک ایسا

ڈھانچہ ہے کہ اس کے عناصر مربوط ہیں اور اس کے اجزاء باہم پیوست ہیں۔ نیز اس کا مقابلہ ایک ایسے متبادل ڈھانچہ کو استعمال کر کے کیا جا سکتا ہو، جس کے مستقل عناصر ہوں جن کو باہم مربوط، ہم آہنگ اور معاون رابطے منسلک رکھیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک ایسے قرآنی اصلاحی خطاب کو وجود میں لائیں جو ہمیں ہماری فسادزدہ صورت حال کی اصلاح سے مایوسی کے عیب وآفت سے نکالے، تو میری نظر میں اصلاح کی اسی قسم کے منہجی فہم کا سہارا لینا ضروری ہے، کیونکہ ہم میں سے بعض کی مایوسی اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ وہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ عالم عربی میں فساد کا مقابلہ علمی وسائنسی قوانین سے ناواقفیت کے مشابہ ہے۔

۹- اصلاح کے منہجی فہم سے ہم ناامیدی وقنوط کے گرداب میں پھنسنے سے نکل جائیں گے، اور ہمیشہ تفاؤل ونیک شگونی اور مستقبل کے سلسلے میں اعتماد کے بندھن میں بندھے رہیں گے۔ قرآن کریم سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نیک وصالح فرد اور نیک وصالح سماج یا قوم میں سے ہر ایک کی طرف سے اصلاح اور اس کی تحصیل کی بھرپور سعی وکاوش ہوتی ہے۔ البتہ اگر مکمل اصلاح کی توفیق نہ ہو تو کیا ناامیدی کا احساس مناسب ہے؟ یہ حکمت عملی کا حصہ نہیں ہے، بلکہ مصلح کو اپنی سعی کے نتائج کی صورت حال کا اقرار کرنا چاہئے، پھر دوبارہ گیند ڈالنے اور اصلاح کرنے کی کوشش کرنی چاہئے (۱)۔

۱- اسی وجہ سے اللہ تعالی ہر اس شخص کی مغفرت فرما دیتا ہے جو اصلاح کی سعی کرتا ہے۔ کبھی مصلح مہارت کی کمی کی وجہ سے کوتاہی کے بھنور میں پھنس کر اصلاح یا مکمل اصلاح حاصل نہیں کر پاتا ہے۔ یہ حکمت کا حصہ ہے۔ امام ابن عاشورؒ کی خوبی اللہ کے لئے ہے، انہوں نے حکمت کا مبنی بر مصلحت تعین یوں فرمایا: ''یہ ایسا علم ہے جس میں لوگوں کے حال اور عقائد کی اصلاح کی نگہداشت رکھی جاتی ہے، اس طرح کہ اصلاح مسلسل جاری رہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو''، دیکھئے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، مرجع سابق، ج ۱۴، ص: ۳۲۷، نیز فرمان باری تعالی ہے: ''ربكم أعلم بما في نفوسكم إن تكونوا صالحين فإنه كان للأوابين غفورا'' (سورۂ اسراء: ۲۵) (تمہارا رب ان باتوں کو خوب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہیں، اگر تم نیکوکار ہو گے تو وہ (اپنی طرف) رجوع کرنے والوں کو بڑا بخشنے والا ہے) کے سیاق میں تحریر فرماتے ہیں: تقدیر عبارت یوں ہے: ''اگر تم نیکوکار اور اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنے والے ہو گے تو وہ نیکوکاروں کو نیک بدلہ دے گا اور اپنی طرف رجوع کرنیوالے کے لئے بڑا بخشنے والا ہے''، دیکھئے: مرجع سابق،

۱۰-اصلاح کی تحصیل وتکمیل کے اسباب کے عمیق شعور کے مدنظر اصلاح بہرحال اپنی تکمیل کے ساتھ مربوط ہے، اس لئے کہ مصلح سمجھتا ہے کہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصلاح کے داخلی اور خارجی موانع اور رکاوٹوں سے آگے بڑھے۔ اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ہم اصلاح کو عملی جامعہ پہنانے سے پہلے اور اپنے اعتقادات، دل اور اعمال کے اندر ظاہر کرنے سے پہلے ان موانع اور رکاوٹوں کی حقیقت اور فطرت کو اچھی طرح سمجھ لیں جو اصلاح کی راہ میں حائل ہوتے رہتے ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ اصلاح میں کامیابی اس اعتبار سے کہ وہ ان اسباب اور مظاہر کا ایک قالب ہے، جن سب کی ایک تاریخ ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اصلاح کی صورت حال کے عناصر کے باہم مربوط اور منسلک ہونے کا عمیق شعور ہو، خواہ اصلاح کی راہ میں حائل ہونے والے موانع کے قبیل سے ہوں، یا ان مثبت عوامل ومحرکات کی قسم سے ہوں جو اصلاح پر آمادہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر: ہماری موجودہ صورت حال جس اصلاح کی متقاضی ہے اسکا ہرگز کوئی مطلب نہیں ہوسکتا ہے، جیسا کہ استاذ محمد عابد جابریؒ نے عکاسی کی ہے۔ خواہ ''اقتدار'' اور اس کے تحفظ کے تقاضے کی سطح پر ہو، یا حکومتی ادارہ اور اسکے عدل وانصاف کے تقاضے کی سطح پر ہو، البتہ اس اصلاح کا مصداق اس وقت پورا ہوگا، جبکہ ''باہر'' کے کردار کو دور کردیا جائے؛ کیونکہ واضح طور پر ''بیرونی کردار'' کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے خطہ میں امریکی قومی مصالح کا تحفظ کیا جاسکے۔ نیز اس اصلاح کا مصداق اس وقت پورا ہوگا جبکہ ''داخلی رول'' کو بھی دور کیا جائے گا، جس ''داخلی رول'' کا واضح اور صریح مطلب یہ ہے کہ حکمراں ٹولہ کے شخصی مصالح کا تحفظ کیا جائے''(۱)۔

۱۱-میری رائے میں ان خارجی اور داخلی موانع اور رکاوٹوں کی سنگینی خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو، اصلاح کی دعوت دینے والے کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اور اس کے مخاطبین اصلاح

ج ۱۵، ص: ۵۷۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مختلف معاملات کی درستگی کے بارے میں اپنے حاصل کردہ تجربات اور اپنے پاس موجود نظری وعملی قواعد واصول کی روشنی میں غور وفکر کرتے ہیں۔

۱- جابری، في نقد الحاجة إلى الإصلاح، مرجع سابق، ص: ۲۳۴۔

کے امکان سے قنوط و ناامیدی اور مایوسی کے بھنور میں گر جائیں۔ اس لئے کہ اصلاح اس کے اسباب کی تحصیل کی ہماری سچی اور ذہانت پر مبنی سعی وکاوش کے بقدر موجود اور ثابت ہے۔ اس طرح اصلاح کے اسباب کے ہمارے علمی شعور کے مدنظر اسلامی مصلح کے غور وفکر کا دائرہ تفاؤل ونیک شگونی اور مستقبل کے سلسلے میں اعتماد کا دائرہ ہے۔

۱۲- یقیناً قرآن مجید میں وارد اصلاح ''تدافع'' اور ''توسط'' سے پیدا ہونے والے اعتقادی، تفکیری اور عملی مظاہر کا ایک ڈھانچہ ہے۔

یہ وہ نقطہ نظر ہے جس کے ذریعہ ہم نے قرآن مجید میں وارد اصلاح کے منہجی فہم کو پیش کرنے کا قصد کیا۔ منہجی فہم سے اگرچہ قرآن مجید میں وارد اصلاح کے اسباب ومظاہر پر ہمہ گیر نظر پختہ ومستحکم ہوتی ہے، مگر وہ محض ایک اقدام ہے، جو حتمی وضروری بھی ہے، لیکن بہرحال وہ محض ایک ابتدائی قدم ہے، جو موجودہ علاقائی، اقلیمی اور بین الاقوامی اس صورت حال کے ہمہ گیر منہجی فہم کے اقدام سے بے نیاز نہیں کرسکتا ہے، جس کے گہوارہ میں مسلمان سانس لے رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے، یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو پیچیدگی کے مخصوص درجات کو پہنچ گئی ہے۔ اس صورتحال کی تشکیل ہوئی ہے اور عالمی تہذیب اور اس نیو ورلڈ آرڈر پر مبنی تہذیب کے پس منظر میں مسلسل اس کی تشکیل ہورہی ہے، جو علمی وسائنسی ایجادات واختراعات اور بین الاقوامی نئے حقائق اور مواصلات اور رابطے کی ٹکنالوجی کے سلسلے میں باہمی سبقت کے ساتھ ممتاز ہے۔ مستقبل میں ان شاء اللہ تعالی اس کی تکمیل کا ہمارا پختہ ارادہ اور عزم مصمم ہے۔

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس کے انعام واحسان کی وجہ سے نیک اعمال پورے ہوتے ہیں، اور درود وسلام نازل ہو ہمارے نبی محمد بن عبداللہ ﷺ، ان کی آل اولاد، صحابہ اور ان سے محبت کرنیوالوں پر۔ اللہ تعالی ہی توفیق سے نوازنے والا ہے۔

۱۹/رمضان المبارک، ۱۴۳۶ھ، مطابق ۶/جولائی ۲۰۱۵ء۔

مراجع ومصادر

۱-اصحی، ابوعبداللہ مالک بن انس، مؤطا، تحقیق: محمد فؤاد عبدالباقی، قاہرہ، داراحیاء التراث العربی (د۔ت)۔

۲-الوسی، شہاب الدین محمود، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، بیروت، دارالفکر (۱۳۹۸ھ/ ۱۹۸۷ء)۔

۳-بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، منصورہ، دارابن رجب، ط:۱، (۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء)۔

۴-بدران، عبدالقادر بن احمد، تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، بیروت، دارالمسیرہ (۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء)۔

۵-بقاعی، برہان الدین ابراہیم بن عمر، مصاعد النظر للإشراف علی مقاصد السور، تحقیق: عبدالسمیع محمد احمد حسنین، ریاض: مکتبۃ المعارف، ط:۱، ۱۹۸۷ء۔

۶-تیجانی، عبدالقادر حامد، الاصلاح فی القرآن: استکشاف المفہوم وبناء النظریۃ، مجلّہ اسلامیۃ المعرفہ، شمارہ:۶۶، ۲۰۱۱ء۔

۷-جابری، محمد عابد، فی نقد الحاجۃ الی الاصلاح، بیروت، منشورات مرکز دراسات الوحدۃ العربیہ، ط:۱، ۲۰۰۵ء۔

۸-ابن الجوزی، بستان الواعظین وریاض السامعین، تحقیق: ایمن بحیری، بیروت، لبنان، مؤسسہ الکتب الثقافیہ، ط:۲، (۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۸ء)۔

۹-حامدی، عبدالکریم، مقاصد القرآن من تشریع الاحکام، بیروت، دارابن حزم، ط:۱، (۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء)۔

۱۰-حرانی، تقی الدین احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ، ''السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ''، تحقیق: علی بن محمد عمران، جدہ وریاض: المجمع العالمی للفقہ الاسلامی، دارعالم الفوائد للنشر، ۱۴۲۹ھ۔

۱۱-حسنی، اسماعیل، الاختلاف والتفکیر فی القرآن الکریم، قاہرہ، دارالسلام، ط:۱، (۱۴۳۶ھ/ ۲۰۱۵ء)۔

۱۲-حسنی، اسماعیل، الاستاذ علال الفاسی وکتابہ النقد الذاتی، انشاءاللہ تعالی یہ کتاب مستقبل قریب میں شائع ہوگی۔

۱۳-حسنی، اسماعیل، الاقتراض البنکی والاضطرار الشرعی، مراکش، المطبعہ والوراقہ الوطنیہ، ط:۲، ۲۰۱۳ء۔

۱۴-حسنی، اسماعیل، الفکر المقاصدی وترسیخ الفکر العلمی، مجلّہ اسلامیۃ المعرفہ، شمارہ:۵۷، (۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء)۔

۱۵-حسنی، اسماعیل، تدبیر الشأن الدینی في المغرب الراہن ومفہوم التوسط فی الاسلام، ندوۃ الخصوصیۃ الدینیہ المغربیہ ومساہمتہا فی مواجہۃ الغلو والتطرف، مراکش: کلیۃ الآداب، ۳۰رمئی، ۲۰۱۵ء۔

۱۶-حسنی، اسماعیل، فقہ العلم فی مقاصد الشریعہ: الاعلام المجالات المفاہیم، مراکش: المطبعہ والوراقہ الوطنیہ، ط:۱، ۲۰۰۴ء۔

۱۷-حسنی، اسماعیل، قراءۃ فی کتاب ''مفہوم الترتیل فی القرآن الکریم النظریۃ والمنہج''، مجلّہ الترتیل، شمارہ:۱، ۲۰۱۳ء۔
۱۸-حسنی، اسماعیل، مقاصد الشریعۃ وأسئلۃ الفکر المقاصدی دراسۃ فی اسئلۃ التدقیق المصلحی والتوظیف المنہجی، رباط: منشورات الرابطۃ المحمدیہ، ط:۱، ۲۰۱۳ء۔
۱۹-حسنی، اسماعیل، نظریۃ المقاصد عند الامام محمد الطاہر ابن عاشور، ہرنڈن، المعہد العالمی للفکر الاسلامی، ط:۱، ۱۹۹۵ء، ۲۰۰۵۔
۲۰-ابوحیان اندلسی، محمد بن یوسف، تفسیر البحر المحیط، بیروت، دار الفکر للطباعۃ والنشر، ۱۹۸۳ء۔
۲۱-خازن، علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم، تفسیر الخازن، ''لباب التاویل فی معانی التنزیل''، تحقیق: عبد السلام شاہین، بیروت، دار الکتب العلمیہ (۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء)۔
۲۲-ابن خلدون، عبد الرحمٰن بن محمد، مقدمہ ابن خلدون، بیروت: دار الجیل العربی (د،ت)۔
۲۳-دروزہ، محمد عزہ، التفسیر الحدیث ترتیب السور حسب النزول، بیروت، دار الغرب الاسلامی، ط:۲، (۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء)۔
۲۴-دغامین، زیاد خلیل، اعمار الکون فی ضوء نصوص الوحی، مجلّہ اسلامیۃ المعرفہ، شمارہ:۵۴، (۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء)۔
۲۵-رازی، فخر الدین، ابوعبد اللہ محمد بن عمر، التفسیر الکبیر ''مفاتیح الغیب''، تقدیم وتحقیق: ہانی الحاج وعماد زکی بارودی، قاہرہ: المکتبۃ التوفیقیہ، ۲۰۰۳ء۔
۲۶-راغب اصفہانی، ابو القاسم حسین بن محمد، الذریعۃ الی مکارم الشریعہ، تحقیق: ابوالیزید ابوزید عجمی، قاہرہ: دار السلام، ط:۱ (۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء)۔
۲۷-راغب اصفہانی، ابو القاسم حسین بن محمد، تفصیل النشأتین وتحصیل السعادتین، بیروت، دار النفائس، ط:۱ (۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء)۔
۲۸-راغب اصفہانی، ابو القاسم حسین بن محمد، مفردات الفاظ القرآن، تحقیق: صفوان عدنان داوودی، دمشق، دار القلم، ط:۳، ۲۰۰۲ء۔
۲۹-رضا، محمد رشید، الوحی المحمدی، بیروت: المکتب الاسلامی، ط:۱۰ (۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)۔
۳۰-رضا، محمد رشید، تفسیر القرآن الحکیم ''تفسیر المنار''، تحقیق: فؤاد سراج عبد الغفار، قاہرہ: المکتبہ التوفیقیہ (د،ت)۔
۳۱-زرکشی، ابوعبد اللہ بدر الدین محمد بن عبد اللہ، البرہان فی علوم القرآن، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم، قاہرہ: مکتبہ دار التراث، ط:۳، (۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء)۔
۳۲-زمخشری، جار اللہ ابو القاسم محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، تحقیق:

عادل احمد عبدالموجود، وعلی محمد عوض، ریاض، مکتبۃ العبیکان، ط:۱(۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء)۔
۳۳-سجستانی، ابوداؤد سلیمان بن الاشعث، سنن ابی داؤد، تحقیق: محمد محی الدین عبدالحمید، بیروت، دارالفکر (د،ت)۔
۳۴-سخاوی، شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن، المقاصد الحسنۃ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنہ، تحقیق: محمد عثمان خشت، بیروت: دارالکتاب العربی، ط:۱، (۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)۔
۳۵-شاطبی، ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ، الموافقات فی اصول الشریعہ، تحقیق: عبداللہ دراز بیروت، دارالمعرفہ (د،ت)۔
۳۶-شافعی، محمد بن ادریس، دیوان الامام الشافعی تحقیق وشرح: یوسف شیخ محمد بقاعی، بیروت: دارالفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، ط:۱ (۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء)۔
۳۷-شیبانی، احمد بن حنبل، مسند الامام احمد، تحقیق: شعیب الارنؤوط ودیگر، بیروت؛ مؤسسۃ الرسالہ، ط:۲، ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء۔
۳۸-طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تأویل آي القرآن، تحقیق: عبد اللہ ترکی، قاہرہ، ہجر للطباعۃ والنشر (۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء)۔
۳۹-طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل آي القرآن، تحقیق: احمد محمد شاکر، قاہرہ، مکتبہ ابن تیمیہ (د،ت)۔
۴۰-ابن عاشور، محمد طاہر، اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام، تیونس، الشرکۃ التونسیہ للتوزیع، ۱۹۷۷ء۔
۴۱-ابن عاشور، محمد طاہر، ''التحریر والتنویر''، تیونس: الدار التونسیہ للنشر، (د،ت)۔ ج۱، ص:۱۱۶۔
۴۲-عبادی، احمد، مفہوم الترتیل فی القرآن الکریم، النظریہ والمنہج، رباط: دار ابی رقراق للطباعۃ والنشر، ط:۱، ۲۰۰۷ء۔
۴۳-عبدالرحمٰن طہ، تعددیۃ القیم ما مداہا؟ وما حدودہا؟ مجلّہ قضایا اسلامیہ معاصرہ، شمارہ: ۲۰-۲۱، ۲۰۰۲ء۔
۴۴-ابن عبدالسلام، عزالدین عبدالعزیز، ''قواعد الاحکام فی مصالح الانام، ضبط ومراجعہ: طہ عبدالرؤوف سعد، بیروت، دارالجیل، ط:۲، (۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء)۔
۴۵-عبدالفتاح سیف الدین، العولمہ والاسلام رؤیتان للعالم، دمشق، دارالفکر، ط:۱، (۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء)۔
۴۶-عجلونی، اسماعیل بن محمد، کشف الخفاء ومزیل الالباس عما اشتہر من الاحادیث علی السنۃ الناس، تحقیق: عبدالحمید بن احمد بن یوسف بن ہنداوی، صیدا، المکتبہ العصریہ، ط:۱، (۱۴۲۰ھ/ ۲۰۰۰ء)۔
۴۷-عروی، عبداللہ، مفہوم الدولۃ، الدار البیضاء: المرکز الثقافی العربی، ط:۸، ۲۰۰۸ء۔
۴۸-ابن عطیہ اندلسی، ابومحمد عبدالحق بن غالب، ''المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز''، تحقیق: المجلس العلمی، تاروانت، رباط: وزارت اوقاف، (د،ت)۔
۴۹-عقاد، عباس محمود، ''حقائق الاسلام واباطیل خصومہ، قاہرہ: المؤتمر الاسلامی، ط:۱، (۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء)۔

۵۰-علوانی، طہ جابر، ''أبعاد غائبۃ فی فکر وممارسات الحرکات الاسلامیۃ المعاصرۃ''، قاہرہ، دارالسلام، ط:۱، (۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۵ء)۔
۵۱-غامدی، علی خمیس، الانسان الصالح وتربیتہ من منظور اسلامی، مکہ المکرّمہ: دار طیبہ الخضراء، ط:۱، (۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ء)۔
۵۲-غزالی، ابوحامد محمد بن محمد، جواہر القرآن، تحقیق: شیخ محمد رشید رضا قبانی، بیروت: داراحیاء العلوم، ط:۲، (۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء)۔
۵۳-ابن فارس، ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا، معجم مقاییس اللغۃ، تحقیق: عبد السلام محمد ہارون، بیروت، دارالجیل (۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء)۔
۵۴-فاسی، علال، مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ ومکارمہا، دراسہ وتحقیق: اسماعیل حسنی، قاہرہ: دارالسلام، ط:۱، (۱۴۳۲ھ/ ۲۰۱۱ء)۔
۵۵-قاضی عیاض، ابو الفضل عیاض بن موسیٰ یحصبی، الشفا بتعریف حقوق المصطفی ﷺ، تحقیق: علی محمد بجاوی، بیروت: دارالکتاب العربی (۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء)۔
۵۶-قرطبی، ابوعبد اللہ محمد بن احمد ''الجامع لاحکام القرآن''، تحقیق: عبد اللہ بن محسن ترکی، بیروت، مؤسسۃ الرسالہ، ط:۱، (۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء)۔
۵۷-قطب، سید، ''خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ''، قاہرہ، دارالشروق (۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء)۔
۵۸-قطب، سید، ''فی ظلال القرآن''، قاہرہ: دارالشروق، ط:۳۰ (۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء)، مجلد: ۴، ج ۱۲، ص ۱۹۳۳۔
۵۹-قصوہ، صلاح، ''نظریۃ القیمۃ فی الفکر المعاصر''، قاہرہ: دارالثقافہ للنشر والتوزیع، ۱۹۸۱ء۔
۶۰-متقی ہندی، علاء الدین علی بن حسام الدین، ''کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال''، تحقیق: بکری حیانی وصفوہ السقا، بیروت: مؤسسہ الرسالہ، ط:۵، (۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء)۔
۶۱-ملکاوی، فتحی حسن، ''التزکیۃ فی منظومۃ القیم الحاکمۃ''، مجلّہ اسلامیۃ المعرفہ، شمارہ: ۵۷، ۲۰۰۹۔
۶۲-ملکاوی، فتحی حسن، ''العمران فی منظومۃ القیم الحاکمۃ''، مجلّہ اسلامیۃ المعرفہ، شمارہ: ۵۹، ۲۰۱۰ء۔
۶۳-ابن منظور، جمال الدین محمد بن مکرم بن علی، ''لسان العرب، بیروت، دارصادر، (د، ت)۔

☆☆☆